HOW TO WIN A COSMIC WAR

CONFRONTING RADICAL RELIGION

by Reza Aslan

کائناتی جنگ

کیسے جیتی جائے؟

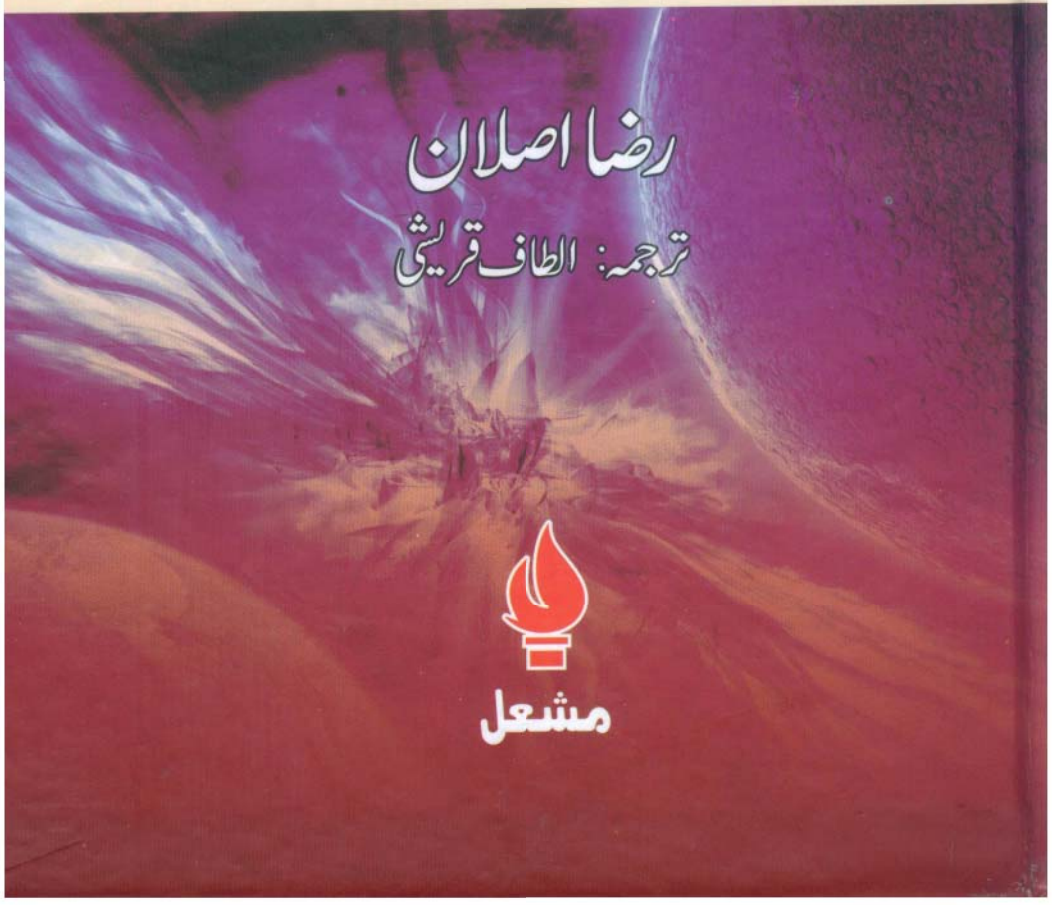

رضا اصلان

ترجمہ: الطاف قریشی

مشعل

کائناتی جنگ کیسے جیتی جائے؟

رضا اصلان

ترجمہ: الطاف قریشی

مشعل بکس

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

کائناتی جنگ کیسے جیتی جائے؟

رضا اصلان
ترجمہ: الطاف قریشی

کاپی رائٹ اردو © 2013 مشعل بکس

کاپی رائٹ © 2009 رضا اصلان

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

پرنٹرز: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

قیمت: -/400 روپے

فہرست

ابتدائیہ	ہم بمقابل وہ	5
حصہ اول		
شناخت کا جغرافیہ		15
باب اول	غیر متصل شخصیت	16
باب دوم	ارض موعود کا وعدہ	37
حصہ دوم		
جنگجو اللہ		63
باب سوم	تمہارے گھر کی خواہش میں میرا ضیاع	64
باب چہارم	معتقدین کی فوج	83
باب پنجم	نزدیک اور دور	109
حصہ سوم		
جنگ کا خاتمہ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں		135
باب ششم	جنریشن ای	136
باب ہفتم	درمیانی راستہ	171
اظہار تشکر		188
حوالہ جات		189

ابتدائیہ

میناروں کے زمین بوس ہونے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غم کی شدت جب راکھ اور خاک کے ساتھ جم سی گئی تو ۹/۱۱ (۱۱ ستمبر) کی دہشت گردی میں ملوث ایک ہائی جیکر کے سامان میں سے ایک انوکھی دستاویز دستیاب ہوئی جس میں دہشت گردوں کو یہ خطرناک اور جان لیوا کام سرانجام دینے کیلئے حتمی ہدایات کی تفصیل درج تھی۔ اس جان لیوا کام کیلئے میں نے قربانی کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے کہ یہ بے نام تحریر مذہبی دستاویز جیسی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ہائی جیکروں کے ذہنوں پر وہ سب کچھ نقش تھا جو انہوں نے کرنا تھا اور ان کے لئے یہ کام جہاد سے کسی صورت کم نہ تھا۔ ''اپنی روحوں کو تمام ناپاک خیالوں سے پاک کرلو''۔ ہائی جیکروں کو کہا گیا تھا۔ ''اپنی روح کو مطیع کرلو، اسے قائل کرو اور سمجھاؤ۔ اسے مکمل طور پر بھول جاؤ جسے ''دنیا'' کہا جاتا ہے۔ ہوٹل سے نکلتے وقت دعا مانگو۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت دعا مانگو۔ ہوائی اڈے میں داخل ہوتے وقت دعا مانگو۔ طیارے میں سوار ہونے لگو تو دعا مانگو۔ موت کے وقت دعا مانگو۔ قرآنی آیات کی تلاوت کے ساتھ اپنے جسموں کو پاک رکھو۔ آیتیں پڑھ کر اپنے سامان پر پھونکیں مارو۔ اپنے کپڑوں پر، اپنے پاسپورٹ پر پھونکیں مارو۔ اپنے چاقو کو آیات کے ذریعے پالش کرو اور یقینی بناؤ کہ تمہارے چاقو کی دھار بہت تیز ہے۔ اپنی قربانی کو اذیت دہ مت بناؤ۔ یاد رکھو کہ وہ تم سے زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں لیکن ان کے ہتھیار، ان کا حفاظتی نظام، ان کی ٹیکنالوجی غرضیکہ کوئی بھی شے تمہیں تمہارے کام سے روک نہیں سکتی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گروہوں نے اللہ کی مرضی سے بڑے بڑے گروہوں کو شکست سے دوچار کیا؟''

''یاد رکھو کہ یہ جنگ اللہ کے لئے ہے۔ دشمن، شیطان کے ساتھی ہیں، ابلیس کے بھائی

ہیں، ان سے مت ڈرو۔ اس لئے کہ اللہ کو ماننے والے صرف اللہ سے ڈرتے ہیں''۔

''اور جب وہ وقت آن پہنچے تو اللہ کی خاطر موت کو گلے لگالو، موت کو خوش آمدید کہو۔ اپنی آخری سانسوں کے وقت بھی اللہ کو یاد کرو۔ تمہارے آخری لفظ یہ ہونے چاہئیں ''کوئی اللہ نہیں سوائے اللہ کے''۔

ان حتمی ہدایات میں بے ڈھنگا پن سہی لیکن اس میں ایک اٹل سچ موجود ہے۔ جن ہائی جیکروں نے ستمبر کی اس صبح کو تین ہزار افراد کو قتل کیا، وہ اپنے تئیں ایک مذہبی فریضہ ادا کر رہے تھے۔ وہ اپنے مقتولین کو اس طرح پچھاڑتے رہے جیسے قربانی کے جانوروں کو مذبح خانوں میں پچھاڑا جاتا ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کو اللہ کیلئے جنگ کہتے ہوئے رضائے الٰہی سے تعبیر کیا۔ انہوں نے ہر لمحے میں، اپنی نیند سے بیدار ہونے کے لمحے سے لے کر اپنی یا اپنے مقتولین کی موت تک اپنی معصومیت اور پارسائی کو برقرار رکھا۔ ان کا عقیدہ ان کی قوت تھا۔

۱۱ستمبر کے واقعات نے جدید دنیا میں نہ صرف مذہب اور تشدد پر بحث مباحثہ کو جنم دیا بلکہ اس بحث کو ناگزیر بنا دیا۔ مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد کے اقدامات کی وجہ سے مذہب پر بہتان تراشی کرنا آسان ہے لیکن اس سے بھی آسان کام ایسے واقعات کو مذہبی صحیفوں کے ساتھ جوڑنا ہے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی بھی مذہب باطنی طور پر نہ تو متشدد ہوتا ہے اور نہ ہی پرامن۔ یہ تو لوگ ہوتے ہیں جو متشدد ہوتے ہیں یا پھر پرامن۔

باوجود یکہ یہ لوگ مسلمان تھے لیکن ان کا بھیانک جرم اوپر پیش کی گئی حقیقت کی نفی نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے کہ اسلام نہ تو امن کا مذہب ہو اور نہ ہی جنگ کا۔ تاہم یہ دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب ہی تو ہے جو رحم دلی اور بے رحمی یا بگاڑ کو تحریک دیتا ہے۔ یہ لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اور اپنے آپ کو یقین دلا رہے تھے کہ جنہیں وہ قربان کر رہے تھے وہ معصوم نہیں تھے بلکہ شیطان کے ساتھی تھے، ابلیس کے بھائی تھے۔ بہرحال جو کچھ بھی داؤ پر لگا ہو، اس گھناؤنے اور مکروہ عمل کے پیچھے کوئی بھی سیاسی یا سماجی محرکات ہوں، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان انیس آدمیوں کو یقین تھا کہ وہ اس طرح اللہ کی رضا حاصل کر رہے ہیں۔ وہ مابعد الطبیعاتی الجھاؤ کا شکار تھے۔ وہ فوجوں یا قوموں کے درمیان تنازعات کا شکار نہیں تھے بلکہ وہ اسے روشنی کے فرشتوں اور اندھیروں کے خداؤں کے درمیان جنگ سمجھتے تھے۔ وہ ایک کائناتی جنگ لڑ رہے تھے، امریکی

امپیریلزم کے خلاف نہیں بلکہ برائی کی ازلی قوتوں کے خلاف۔

یہ کائناتی جنگ ایک مذہبی جنگ ہے۔ یہ ایک ایسا تنازعہ ہے، عقیدے کی رو سے جس میں اللہ براہ راست ایک فریق ہے وہ جنگ کے ایک فریق کے ساتھ ہے۔ غیر متماثل مذہبی جنگ دو متحارب مذہبی گروہوں کے درمیان لڑی جاتی ہے۔ کائناتی جنگ اس رسمی ناٹک کی طرح ہوتی ہے جس میں شریک لوگ جنگ تو زمین پر لڑتے ہیں لیکن ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ جنگ آسمانوں پر لڑی جارہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس دنیا میں یہ حقیقی سطح پر جسمانی یا مادی جنگ ہوتی ہے جبکہ ماورائی سطح پر یہ اخلاقی تصادم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تصادم حقیقی ہو اور اس میں ہتھیار استعمال ہورہے ہوں لیکن تصور یہی کیا جاتا ہے کہ یہ جنگ روحانی سطح پر لڑی جارہی ہے اس لئے کہ ہم انسان تو محض اللہ کے تحریر کردہ مقدس سکرپٹ کے اداکار ہیں۔

کائناتی جنگ لوگوں کو اللہ کے سپاہیوں میں تبدیل کردیتی ہے جنہیں درحقیقت سفّاک، ظالم اور ٹھگ قرار دیا جانا چاہیئے۔ ایسی جنگ میں وہ لوگ قربانیاں دینے والے مان لئے جاتے ہیں جو ہلاک ہوجاتے ہیں اور تباہی و بربادی کے ان اقدامات کو واجب اور صحیح گردانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ اقدامات اخلاقیات کے انسانی تصورات کے پابند نہیں ہوتے۔ کیا ایسے کائناتی جنگجوؤں کا اخلاقیات سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے جو اللہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہوں؟

کائناتی جنگ چالاکی، عیاری یا حکمت عملی سے نہیں بلکہ عقیدے کی طاقت سے جیتی جاتی ہے۔ کائناتی جنگجو جنگی مہارت مثلاً اسلحے کی قوت یا لڑنے والوں کی تعداد جیسے معاملات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کے لئے بس اتنا ہی سمجھنا کافی ہے کہ اللہ کے غضب کی بھرپور قوت کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہونے کیلئے اپنے ارادے کو اللہ کی منشاء کے تابع کرلیا جائے۔ وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ انجام انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتا۔

کائناتی جنگ دنیا کو سیاہ اور سفید، اچھائی اور بُرائی، ہمارے اور ان کے درمیان تقسیم کردیتی ہے۔ ایسی جنگ میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو ایک راستہ منتخب کرنا ہوتا ہے۔ سپاہی اور شہری، جنگجو اور جنگ سے دور رہنے والا، جارح اور تماشائی۔ تمام روایتی تقسیم، حصے بخرے جو حقیقی جنگ میں نشاندہی کرنے والوں کا کردار ادا کرتے ہیں، ان کائناتی جنگوں میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہوجاتے ہیں۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر تم ''ہم'' نہیں ہو تو پھر تم ''وہ'' ہو۔ اگر

تم ''وہ'' ہو تو پھر تم دشمن ہو اور تمہیں تباہ ہو جانا چاہیے۔

ایسی غیر مصالحانہ تقسیم دشمن کو نہ صرف غیر انسان بنا دیتی ہے بلکہ دشمن کو راکھشس بنا دیتی ہے، یوں یہ جنگ متحارب قوموں یا ان کے فوجیوں، ان کے شہریوں کے خلاف نہیں بلکہ شیطان اور اس کے چیلوں کے خلاف لڑی جاتی ہے۔ اگر ہم اچھائی کی طرف ہیں تو وہ بدی کی طرف سمجھے جائیں گے۔ اسی طرح کائناتی جنگ کا بنیادی مقصد زمینی طاقت کو شکست دینا نہیں بلکہ بدی کو ختم کرنا ہے۔ ایسی کائناتی جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے، اس کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا اور آخر کار یہ ایک نہ ختم ہونے والے تصادم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کائناتی جنگ نہ جیتی جانے والی ہے تو پھر یہ ہاری جانے والی بھی نہیں ہے۔ کائناتی جنگیں زمین یا سیاست کی خاطر نہیں لڑی جاتیں بلکہ شناخت کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ مبہم اور غیر واضح دنیا میں اپنی شناخت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ ایسی جنگ میں ہارنے کا مطلب عقیدے کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کائناتی جنگ میں مصالحت کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس میں نہ تو مذاکرات ہوتے ہیں، نہ تصفیہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہتھیار ڈالے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ریاستہائے متحدہ پر حملہ کیا، وہ ایک کائناتی جنگ لڑ رہے تھے، اس غیر اخلاقی اور غیر اسلامی عمل کی ادائیگی میں اگر وہ کسی تذبذب کا شکار تھے تو انہیں ان کے یقین کامل نے اس تذبذب سے نکال دیا کہ وہ خود یہ جنگ لڑ رہے تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ خود ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے جو یہ سمجھتے ہوں کہ وہ کسی ایسی قابض قوت کے خلاف لڑ رہے تھے جس نے انہیں بے روزگار کر کے مایوس و ناامید کر دیا ہو۔ نہ ہی یہ وہ لوگ تھے جن سے سب کچھ چھین لیا گیا ہو، یا جنہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا یا وہ غربت کا شکار ہوں۔ انہوں نے کسی خاص مقصد کے حصول یا کسی خاص غلطی کی درستگی کیلئے ریاستہائے متحدہ پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ مذہبی مفکر بروس لنکولن کے مطابق، اس کا مقدر یہ بتانا، یہ واضح کرنا تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایسی طاقت ہے جو ان کے دشمنوں سے کہیں زیادہ بڑی اور مختلف نوعیت کی ہے۔

''اللہ کی مرضی سے کتنے ہی چھوٹے گروہوں نے اپنے سے بڑے گروہوں کو شکست سے دوچار کیا ہے''۔

درحقیقت ۱۱ ستمبر کے حملوں کے ذمہ داروں نے ریاستہائے متحدہ اور مغربی دنیا کے خلاف

اپنی شکایتوں اور تکلیفوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ فلسطینیوں کے مصائب، عرب دنیا کے آمروں کیلئے امریکی حمایت، مسلمان دنیا میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ردعمل ظاہر کیا ہے۔ یہ شکایتیں جائز ہوں گی لیکن جہادیوں کیلئے یہ حقیقی کی بجائے علامتی ہیں۔ پالیسیوں کو ٹھیک کرنا یا مسائل کو حل کرنا ان کے نزدیک اتنا اہم نہیں بلکہ ان کے لئے مبہم تصورات کے لئے یکجا ہو کر لڑنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ہائی جیکروں نے کسی بھی لمحے یہ نہیں سمجھا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون پر حملہ کرنے سے فلسطین میں امن قائم ہو جائے گا یا مشرق وسطیٰ سے امریکی فوجیں نکال لی جائیں گی۔ حقیقت میں تو وہ جانتے تھے کہ ان کے اس عمل سے علاقے میں مزید امریکی فوجیں آئیں گی۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کائناتی جنگ لڑنے والے ایک تصوراتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ حقیقی معنوں میں نہ تو جیتی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کی کامیابی کا کوئی پیمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان کا مقصد عالمی تبدیلی سے کم نہیں لیکن اس قسم کی تبدیلی کیا شکل اختیار کرے گی، نئے نظام کی قیادت کون کرے گا اور وہ نیا نظام آخر کار کیا ہوگا؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ دنیا اس بہاؤ کی مکمل لپیٹ میں نہ آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کسی بھی قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے بارے میں بات کم ہی کرتے ہیں خصوصاً سماجی یا سیاسی ایجنڈے کے حوالے سے وہ بات ہی نہیں کرتے۔ القاعدہ جیسے انتہا پسند گروہوں کی طرف سے دنیا پر تسلط قائم کرنے کے شور و غوغا کے باوجود یہ گروہ خود ایسے دعوے کم کم ہی کرتے سنائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بن لادن کی تمام تحریریں، تقریریں اور دعوے اٹھا کر دیکھ لیں، متبادل سماجی پروگرام کا ان میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ القاعدہ کے آئین کو دیکھ لیں، اس میں ان کے اپنے مبہم وعدوں کو پورا کرنے کیلئے کوئی تجویز، پالیسی یا منصوبہ موجود نہیں اور نہ ہی اس میں سچ کو رائج کرنے اور بدی سے جان چھڑانے کیلئے کوئی تجویز آپ کو ملے گی۔ القاعدہ جیسی تنظیم کے ساتھ تو صرف ایک بات جڑی ہوئی ہے کہ اس کے ارکان صرف شہادت کی عظمت کے جذبات سے سرشار ہیں۔ یہ اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ اس کے مقاصد چاہے وہ کتنے ہی غیر متشکل اور غیر واضح کیوں نہ ہوں، اس دنیا مین ان کا حصول ناممکن ہے۔ القاعدہ اچھی طرح جانتی ہے کہ نہ تو وہ تمام سرحدوں کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی وہ پوری دنیا میں خلافت قائم کرنے کے قابل ہے۔ وہ تو

عرب ممالک اور مسلم دنیا پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو شکست دینا تو دور کی بات، اس علاقے سے امریکی اثر ونفوذ بھی ختم نہیں کر سکتی۔ اس کو یہ امید نہیں کہ وہ اسرائیل کو نقشے سے مٹا سکتی ہے۔

اپنی دیوانگی کے باوجود انہوں نے اسی قسم کی اوٹ پٹانگ خواہشیں ہمارے عوام کے ذہنوں میں ڈال دی ہیں جبکہ حقیقت میں القاعدہ کے دہشت پسندوں میں اتنی اہلیت نہیں کہ وہ اپنی دہشت سے خوفزدہ کر سکیں۔ اس قسم کی دہشت گردی کے عمل کو پولیٹکل سائنس کے ماہر جون موئیلر (John Mueller) نے سیاسی، عسکری، اقتصادی، میڈیا اور مذہبی مفادات کی صنعت کا نام دیا ہے اور اس کا مقصد امریکیوں کو باور کرانا ہے کہ دہشت گرد کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت اور کسی بھی قسم کے اسلحہ سے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ امریکہ کی ہوم لینڈ سیکورٹی مینی فیسٹو میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

ایک لمحے کے لئے اس امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ کوئی شخص دہشت گردی کی بجائے آسمانی بجلی گرنے سے ہلاک ہو سکتا ہے، یہ دیکھیں کہ اس قسم کے بے دم اعلانات سے کیا منکشف ہوتا ہے؟ اور یہ کہ قوت کو خیالی شکل دینے سے دہشت گردی کس قدر موثر ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دہشت گردوں کے مقاصد چاہے کتنے ہی مہمل اور بے معنی کیوں نہ ہوں، ان کا حصول کتنا ہی ناممکن کیوں نہ ہو، اس کائناتی جنگ کا مقصد اور اس کی قوت موجود ہے۔ یہ ناممکن فتح کی امید دیتی ہے۔ تمام کائناتی جنگجوؤں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس کو فراموش کر دیں جسے دنیا کہا جاتا ہے اور بعد از موت دنیا کو ذہن میں رکھیں۔

۱۱ ستمبر کے واقعہ کے ذمہ داروں کی واحد خواہش بن لادن کے لفظوں میں یہ تھی کہ عیسائیوں کی شروع کی ہوئی صلیبی جنگ کے مقابلے میں مسلمان یکجا ہو جائیں اور ہر قیمت پر اپنے اتحاد کو برقرار رکھیں۔ اپنی کائناتی جنگ کو جاری رکھیں۔ اس لئے کہ اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ سماجیاتی علوم کے ماہر مارک جوئیر جن سمیئر (Mark Juergensmeyer) ''جس نے کائناتی جنگ کی اصطلاح متعارف کروائی، لکھتے ہیں کہ ''جنگ کی حالت میں رہنے کا مطلب ایسی دنیا میں رہنا ہے جس میں افراد جانتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ انہوں نے تکالیف کیوں اٹھائیں اور کن کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوئے اور ثابت قدم رہنے کیلئے انہوں نے کیا قیمت ادا کی ہے''۔

۱۱ستمبر کے حملے کو اعلان جنگ کہا گیا ہے۔لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایسی جنگ میں شریک ہوئے جو پہلے سے جاری تھی۔ایک کائناتی جنگ جو مذہبی حوالے سے نیکی اور بدی کے درمیان ازل سے جاری ہے۔یہ ایسی دعوت مبارزت تھی جسے خود امریکہ کے اپنے کائناتی جنگجو تسلیم کر رہے تھے۔

ایک مجنونانہ نظریے ''نازی ازم'' کے خلاف ہونے والی عالمی جنگ اور پھر ایک اور ایسے ہی نظریے ''سٹالن ازم'' کے خلاف لڑی جانیوالی سرد جنگ کے آغاز سے ذرا پہلے ایرک ہوفر نے لکھا تھا کہ ''معمول کے حالات میں جمہوری قوم، آزاد افراد پر مشتمل ایک آئینی اور قانونی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور جب اس کے وجود کو خطرہ درپیش ہوتا ہے تو اسے اپنے لوگوں کو متحد کرنا اور ان میں انتہائی جذبۂ قربانی پیدا کرنا ہوتا ہے۔جمہوری قوم کو اپنے آپ کو بالکل جنگجو چرچ یا ایک انقلابی جماعت کی شکل میں ڈھالنا ہوتا ہے''۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگون پر حملوں کے لمحوں بعد امریکہ میں بھی اسی قسم کی تبدیلی کا آغاز ہو گیا تھا۔یہ معمول کا زمانہ نہیں تھا۔لوگوں میں مقبول عیسائی وزیر ٹم لاہائے نے، جو سلسلہ وار ''لیفٹ بی ہائنڈ'' کے مصنف ہیں اور جن کا اثر ورسوخ راسخ العقیدہ عیسائیوں پر بہت زیادہ ہے، لاکھوں امریکیوں کو یہ یقین دلا کر متحرک کیا کہ گیارہ ستمبر زندگی کے اختتام کا نکتہ آغاز ہے۔یہ کوئی معمول کی جنگ نہیں۔ایک قوم کے طور پر ہماری شناخت خطرے میں ہے۔دنیا دو دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔اچھے لوگ ایک طرف اور برے لوگ دوسری طرف اور فتح تبھی ممکن ہوگی جب 'بقول جارج ڈبلیو بش' ہم ''بدی کی اس دنیا'' سے نجات حاصل کر لیں گے۔

یہ کوئی روایتی دشمن نہیں ہے۔جارج میکین نے اعلان کیا تھا کہ ''یہ ماورائے ادراک بدی ہے جس کا مقصد ہر اس چیز کو تباہ و برباد کرنا ہے جس کی ہم حمایت کرتے ہیں اور جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔یہ وہ دشمن ہیں جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے، جو ہماری سوچ کے بالکل الٹ سوچتے ہیں''۔ ''سابق نائب وزیر دفاع لیفٹیننٹ جنرل ولیم جی بوئیکن جن پر بن لادن کا شکار کرنے کا الزام ہے ، نے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا کہ ''ہمارا دشمن روحانی دشمن ہے اس لئے کہ ہم ایمان والی قوم ہیں''۔اوریگون میں ایک مذہبی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''اس کا نام شیطان ہے۔شیطان ہمیں قوم اور عیسائی فوج کی حیثیت سے تباہ کرنا چاہتا ہے''۔

''وہ ہمارے مخالف ہیں۔ یہ ایک مابعد الطبیعاتی تصادم ہے۔ اخلاقی تحفظات کو بالائے طاق رکھنا ضروری ہے۔ دشمن نہ تو کوئی فوج ہے اور نہ ہی کوئی ریاست بلکہ یہ بذات خود بدی ہے۔ یہ جنگ تہذیب کی جنگ ہے۔ ہماری شناخت داؤ پر لگی ہے۔ ہم مذاکرات نہیں کر سکتے۔ ہم ہتھیار نہیں ڈال سکتے۔ ہم ہار نہیں مان سکتے۔ مذہبی بلاغت اختیار کر کے اور القاعدہ جیسے گروہوں کے کائناتی نقطہ نظر کی روشنی میں ہم جیت نہیں سکتے۔ ہمیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دہشت گرد تنظیمیں جو شیطانی طاقت ہیں، انسانی تہذیب کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی ایسی عالمی مجرمانہ سازش ہے جسے انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو کائناتی جنگ کے طور پر لینا چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ ہم ان انتہا پسند مسلم جنگجوؤں کے ہاتھوں میں کھیلے ہیں بلکہ ہم نے مذہبی جنگ کے نئے اور ہولناک دور کو پنپنے دیا ہے''۔

اللہ کی موت کے بارے میں پیشن گوئیوں کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ صدیوں پہلے کی نسبت اس وقت مذہب زیادہ مضبوط اور عالمی طاقت کے طور پر موجود ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز پر دنیا کی آدھی آبادی اپنے آپ کو کیتھولک، پروٹسٹنٹ، مسلمان یا ہندو کے طور پر شناخت کرتی تھی، سو سالہ سماجی ترقی، فنی و حرفی ایجادات اور سائنسی ترقی و برتری کے باوجود مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والوں کی یہ تعداد تقریباً دو تہائی تک پہنچ چکی ہے۔ جبکہ دنیا بھر میں خود ساختہ دہریوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے (ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن خود کو کسی خاص مذہبی روایت سے منسلک نہیں رکھتے) ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کسی خاص چرچ یا مذہبی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ بنیاد پرستوں کی تعداد، بے تعصب اور اعتدال پسند لوگوں کی تعداد سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔

مذہبی تشخص کی اس ترنگ کی وضاحت کیسے کی جائے؟ اسکا ایک سبب تو وہ سیکولر قوم پرستی کی ناکامی ہو سکتی ہے، جو انیسویں اور بیسویں صدی کا نظریاتی اصول بین الاقوامی امن اور خوشحالی کو فروغ دیتا رہا ہے۔ اگرچہ یہ ایک تاریخی سچ ہے کہ ناقابل بیان جرائم کا ذمہ دار مذہب ہی رہا ہے۔ لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ گذشتہ ایک صدی کے دوران سیکولر نظریات مثال کے طور پر فاشزم ''نازی ازم'' ماؤازم، سٹالن ازم'' سوشلزم یہاں تک کہ ڈارونزم کے نام پر بھی بہیمانہ حیوانی تشدد کو فروغ ملا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سیکولر ازم کے فروغ کی بنیاد اگر مذہب پر ختم ہونے والے

عقیدے پر ہے تو پھر ممکن ہے کہ سیکولرازم پر بڑھتی ہوئی بداعتمادی کی وجہ مذہبی تشخص کا فروغ ہو۔

تاہم بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ عالمگیریت (گلوبلائزیشن) نے لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنی شناخت کے حوالے سے بنیادی سوچ میں تبدیلی پیدا کردی ہے۔ دنیا بھر میں سیکولرنیشلزم نے نسلی، قبائلی اور اس سے بھی بڑھ کر مذہبی بنیاد پر نیشنلزم کی نئی شکلوں کو راہ دی ہے۔ تیزی کے ساتھ ایک ہوتی ہوئی دنیا میں جہاں قومی ریاستیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہیں، مذہب کو محض ان عقیدوں اور رسومات کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا جو کوئی شخص اپنے طور پر اپناتا ہے۔ بلکہ وہ ایک شناخت بن چکا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کے بہت سے حصوں میں مذہب تیزی کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین شناخت بنتا چلا جا رہا ہے جو نسل، ثقافت اور قومیت پر حاوی ہوچکا ہے۔

ایسی دنیا میں، جہاں مذہب اور سیاست کے معانی ایک سے ہوتے جارہے ہیں، یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ مذہبی رنجشیں یا تکالیف کسی بھی صورت میں سیاسی رنجشوں یا تکلیفوں سے کم نہیں اور نہ ہی مذہبی تشدد پسندی سیاسی تشدد پسندی سے زیادہ عقلی یا معقول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائناتی جنگیں بعض اوقات سیاسی جنگیں بھی ہوسکتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ جنگیں نہ صرف اگلی دنیا کی ضامن ہوسکتی ہیں بلکہ اس موجودہ دنیا کی کایا پلٹ کی ضمانت دے سکتی ہیں۔ صرف اس حکم نامے کے مطابق سیاسی جنگیں ختم ہوسکتی ہیں، سیاسی مشکلات کا ازالہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ کائناتی جنگیں ابدی جنگیں ہوتی ہیں جن میں ہار جیت نہیں ہوتی۔

عالمگیریت کے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے رجحان اور سیکولرنیشلزم کے مستقل تنزل کے اس سفر کے ہوتے ہوئے انقلابی اور بنیاد پرست قوتیں یہودی، عیسائی اور مسلم روایات میں داخل ہوچکی ہیں، جن کا صحیح طور پر مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں ان لوگون کے مذہبی عقائد میں موجود تضادات کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے رہنماؤں اور اپنے دشمنوں کو مذہبی تضادات کو ہوا دینے والی تقریروں سے باز رکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنی توجہ اس مسئلے پر مرکوز کرنا ہوگی جس کی وجہ سے یہ تضادات پیدا ہوتے ہیں اور ان زمینی مسائل کے بارے میں بات کرنا ہوگی جو کائناتی جنگ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہائی جیکروں کی ناراضگیاں اور رنجشیں علامتی ہوں اور جو لاکھوں مسلمانوں کی رنجشیں ہوں۔ ایسا تو نہیں کہ یہ ناراضگیاں بلاسبب ہوں۔ ان کے پیچھے کچھ اسباب تو ہوں گے جن کا دور

کرنا ضروری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فلسطینی اسرائیلی قابضین کے ظلم وتشدد کا شکار ہیں۔ عرب دنیا کے آمر امریکی پالیسیوں کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ مسلم دنیا کے پاس یہ سمجھنے کی وجہ موجود ہے کہ مغرب کی طرف سے ہونے والی صلیبی جنگ ان پر منڈلا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان شکایات کے ازالے سے کائناتی جنگجو، چاہے وہ مسلم ہوں، یہودی یا عیسائی، مطمئن نہ ہوسکیں۔ تاہم اس طریقے سے ان کی کائناتی جنگ کو زمین پر واپس لایا جاسکتا ہے جہاں ان کا سدباب مثبت طور پر کیا جاسکتا ہے۔ آخری بات یہ کہ کائناتی جنگ جیتنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس جنگ سے دور رہا جائے اور محاذ آرائی سے اجتناب کیا جائے۔

حصہ اول

شناخت کا جغرافیہ
غیر متصل شخصیت

باب اول

بن گوریان انٹرنیشنل ایئرپورٹ روشنیوں سے منور اور خوبصورت ہی نہیں بلکہ بے حد مضبوط طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، بالکل تل ابیب کی طرح۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ ایئرپورٹ عرب کے قدیم شہر جافہ کی طرح صحرا کی ریت میں سے ابھرا ہو۔ اسے اسرائیلی ریاست کے بانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ اسرائیل کی سماجی اور فنی ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے جو اپنے ازلی دشمنوں کے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ دراصل بن گوریان کا بنیادی مقصد تل ابیب میں ان دشمنوں کو داخل ہونے سے روکنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات تمام بین الاقوامی ہوائی اڈوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جنہیں ۱۱ستمبر کے بعد امریکہ میں داخل ہوتے وقت امریکی ہوائی اڈوں پر جسمانی تلاشی، انگلیوں کے نشانات اور تصاویر اتروانے کے حوالے سے ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ آج کے جدید دور میں ہوائی اڈے ایک طرح کی شناختی ڈائریکٹری کی شکل اختیار کر چکے ہیں جہاں پر قومیت کے حوالے سے ہر شخص کو اس کی متعلقہ قطار میں کھڑا کر کے اس کی پوری طرح شناخت کی جاتی ہے اور تمام کوائف درج کئے جاتے ہیں۔

لیکن اسرائیل نے اس عمل کو بے مثال بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ آپ جہاز سے باہر نکل کر دو سیڑھیاں ہی اترتے ہیں کہ ربیوں والی ٹوپی پہنے، پھنسیوں بھرے چہرے والے امیگریشن افسر آپ کو ٹیک لگا کر بھیڑ سے الگ کر دیتے ہیں۔

''جناب پاسپورٹ'' وہ پوچھتا ہے ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں اس کو سچ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ میں غزہ جانا چاہتا ہوں جس میں آمد و رفت کئی ماہ پہلے سے ہی بند کی جا چکی ہے۔ ۲۰۰۶ء میں جب فلسطینیوں نے پہلی بار آزاد اور شفاف انتخابات کا

ذائقہ چکھا تو انہوں نے الفتح کے سیکولر لیکن بظاہر بے عمل سیاستدانوں کی بجائے مذہبی قوم پرستوں کی جماعت حماس کو بھاری تعداد میں ووٹ دے کر کامیاب کروایا۔ الفتح کا سنگ بنیاد یاسر عرفات نے ۱۹۵۸ء میں رکھا تھا۔ فلسطینیوں کو حق خود اختیاری دینے کے وعدے کے باوجود اسرائیل، امریکہ اور یورپی طاقتوں نے فیصلہ کیا کہ حماس کو حکومت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس لئے کہ حماس کا بنیادی منشور اسرائیلی ریاست کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کا فوجی ونگ جو عز الدین القاسم بریگیڈ کے نام سے جانا جاتا ہے، لاتعداد اسرائیلی شہریوں اور فوجیوں کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ غزہ کو، جو ایک بنجر تنگ پٹی پر مشتمل علاقہ ہے، باہر کی دنیا سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ حماس کے مضبوط قلعے کو باہر کی دنیا سے الگ کر دیا گیا۔ بین الاقوامی امداد بند ہوگئی اور ''نیویارک ٹائمز'' کے مطابق ایک منصوبہ بنایا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین اتھارٹی کو عالمی طور پر انتہائی کمزور کر دیا جائے اور اس کے بین الاقوامی رابطے ختم کر دیئے جائیں اور یہ دباؤ اس حد تک بڑھایا جائے کہ نئے انتخابات کروانا مجبوری بن جائیں۔ اس وجہ سے حماس اور الفتح میں تشدد آمیز کشیدگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں مقبوضہ علاقے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے یعنی مغربی علاقہ (ویسٹ بنک) جو الفتح کے زیر تسلط تھا اور جسے اسرائیل اور مغربی دنیا سے مدد ملتی تھی اور دوسرا غزہ جس پر حماس کی حکمرانی تھی لیکن اسے باقی دنیا سے کاٹ دیا گیا اور جو پندرہ لاکھ بھوکے ننگے لوگوں کی جیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

میں تل ابیب سے چند میل دور شمالی غزہ کے ایک تباہ شدہ گاؤں ام النصر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ ماہ قبل دو معصوم بچوں سمیت بہت سے دیہاتی گندے پانی کے جوہڑ میں ڈوب گئے تھے۔ ام النصر کے دیہاتی ایک عرصے سے اسرائیلی حکام پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ جوہڑ کے پانی کے نکاس کا انتظام کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے پمپوں اور پائپوں کو خریدنے کی اجازت دی جائے لیکن اسرائیلی حکام نے انکار کر دیا اور غزہ کی جانب سے فائر ہونے والے راکٹوں سے بند کو توڑ دیا اور پھر سب کچھ تباہ ہوگیا۔ انسانی فضلے کی پھیلتی ہوئی اس جھیل کے ارگرد دیہاتیوں نے مٹی کے بند بنائے لیکن وہ بند گندگی کے اس سیلاب کو نہ روک سکے تھے۔ چنانچہ ۲۷ مارچ ۲۰۰۷ء کی صبح جب ابھی ام النصر کے لوگ بیدار بھی نہ ہوئے تھے، یہ بند ٹوٹ گئے اور پورا گاؤں گندگی کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ جب ہم غزہ کی بات کرتے ہیں تو اسی قسم کی گفتگو کرتے ہیں کہ انسان، مرد، خواتین اور بچے، گندگی

میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں وہ جگہ دیکھنے آیا ہوں''۔ میں نے کہا۔

''یہ کوئی مطمئن کرنے والا جواب نہیں ہے'' اور پھر مجھے کھڑکیوں کے بغیر ایک کمرے میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہی سوال دوہرایا جاتا ہے۔ اس بار یہ سوال نسبتاً زیادہ عمر کا افسر مجھ سے کرتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزر جاتا ہے اور پھر تیسرا افسر اندر داخل ہو کر وہی سوال دوہراتا ہے ''تم یہاں کیوں آئے ہو''؟

اس کے بعد یہی سوال پہلے دفتر کے اندرونی حصہ کے ایک بے آباد چھوٹے سے کمرے میں کیا جاتا ہے اور پھر اس سے بھی چھوٹے ایک اور بے آباد کمرے میں سوال دہرایا جاتا ہے۔ بعد ازاں امیگریشن آفس کے باہر لگی قطار میں اور پھر سامان حاصل کرنے والی جگہ اور دوبارہ سے کسٹمز آفس کے باہر یہی سوال دوہرایا جاتا ہے اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ ''واقعی میں یہاں کیوں آیا ہوں''۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ کوئی استقبالی فقرہ ہو۔

مسئلہ اسرائیل کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ ہے، میری شناخت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ میری شہریت امریکہ کی ہے میری قومیت ایرانی ہے۔ میں ایرانی النسل ہوں۔ مشرق وسطیٰ کی ثقافت میری ثقافت ہے۔ میرا مذہب اسلام اور جنسی طور پر میں مرد ہوں۔ میری شناخت کی تمام صورتیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی طور خوش مذاق امیگریشن افسروں کیلئے ختم نہ ہونے والا خطرہ بن جاتی ہیں۔ ان افسروں کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنے اور مجھ جیسے لوگوں کے درمیان فاصلہ رکھیں۔

اس کے باوجود تمام تر عمل کے دوران، میں ممتاز فرانسیسی نظریہ ساز ارنسٹ ریناں کے بارے میں سوچتا رہا جس نے برسوں پہلے قوم کی تعریف اس طرح کی تھی کہ ''یہ ایسے لوگوں کا گروہ ہوتا ہے جو ماضی کے بارے میں غلط نکتہ نظر رکھنے اور اپنے ہمسایوں سے نفرت کی بنیاد پر متحد ہوں''۔ اس تعریف میں سب سے زیادہ وہ لوگ آتے ہیں جو مشرق وسطیٰ میں نئی قوموں کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ شاید اس پر زیادہ حیرت زدہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ اس خطے میں قوم پرستی کا جذبہ دیر سے آیا اور وہ بھی دوسروں کی مرضی سے، تو یہ وہی خطہ ہے جو عالمگیریت

(گلوبلائزیشن) کی تیزی کے ساتھ ابھرتی ہوئی لہر کے سبب قوم پرستی کے تصور کا شکار ہوا ہے۔

عالمگیریت کا مطلب مختلف لوگوں کیلئے مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ اصطلاح بذات خود نئی ہے اور بیسویں صدی کی اسّی کی دہائی کے دوران ہمارے سامنے آئی لیکن اس کا مطلب ہے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی تبدیلیاں، جو صدیوں سے ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کا عمل اس وقت شروع ہوا جب ابتدائی انسانوں نے شکار، پناہ گاہوں اور بہتر موسموں کی تلاش میں افریقہ سے باہر قدم نکالے۔ شہنشاہی دور کسی حد تک گلوبلائزیشن کی انتہا تھا۔ رومیوں مشرقی رومی سلطنت کے باشندوں، ایرانیوں اور منگولوں نے اپنی تجارت، ذرائع مواصلات اور ثقافتوں کو دور دراز کے علاقوں میں متعارف کروانا شروع کیا۔ نوآبادیاتی دور کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے جس میں ہمسایہ بادشاہتوں کے درمیان تجارتی تعلقات کو بہتر انتظامی شکل دی گئی چاہے وہ انتظامی شکل غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم اس کا مقصد مقامی آبادیوں پر مکمل اقتصادی عمل داری اور معاشی تسلط قائم کرنا ہے۔ بہرحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذہب سے زیادہ کوئی اور قوت گلوبلائزیشن کو رائج کرنے میں کردار ادا کرتی ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جس کا اس حوالے سے سب سے اہم کردار ہے۔ اس لئے کہ مذہب کا پیغام علاقائی سرحدوں، قبائلی اور نسلی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ آسان ترین لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گلوبلائزیشن کوئی نیا عمل نہیں ہے۔

آج کے زمانے میں گلوبلائزیشن کی اصطلاح بین الاقوامی مالیاتی نظام کے پھیلاؤ، قومی مفادات کی مربوطی، گلوبل میڈیا اور انٹرنیٹ جیسی مواصلاتی ٹیکنالوجی کے عروج اور لوگوں کی بڑے پیمانے پر ہجرت جیسے جدید رجحانات کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور یہ سب کچھ خودمختار ریاستوں کی علاقائی سرحدوں پر ہو رہا ہے۔ جدید گلوبلائزیشن کی آسان فہم اور واضح تعریف ڈنمارک کے دو سیاسی فلسفیوں ہنیز ہینرک ہوم اور جارج سورنیسن نے کی ہے۔ وہ اسے سرحدوں کے آر پار اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تعلقات میں تیزی کے ساتھ ہوتی ہوئی بڑھوتری قرار دیتے ہیں۔ لیکن میں سماجیات کے ماہر رونالڈ رابرٹسن کے نکتہ نظر کو ترجیح دیتا ہوں۔ رابرٹسن اسے وہ نظریہ قرار دیتا ہے جو دنیا کے دباؤ اور عالمی آگہی میں تیزی کے باعث وجود میں آیا۔

گلوبلائزیشن، محض ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقی اور بین الاقوامی تعلقات میں بڑھوتری کا نام نہیں۔ یہ تو وہ نکتہ نظر ہے جو ایک فرد اپنی ذات کے حوالے سے دنیا کو محض ایک جگہ کے طور پر

دیکھتا ہے۔ دنیا اتنی نہیں بدلی جتنا ہم خود تبدیل ہوئے ہیں۔ ہم اپنی شناخت ایک سماجی رہتل میں کیسے کرتے ہیں، ہم دنیا کو کس انداز سے دیکھتے ہیں، ہم اپنے ہم خیالوں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، ہم مذہبی اور سیاسی رہنمائی کے لئے کس قسم کے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں، ہم مذہب اور سیاست کی درجہ بندی کس طرح کرتے ہیں۔ ہم انفرادی طور پر اور ایک بڑے معاشرے کے ارکان کی حیثیت سے اپنا تعین کہاں کرتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس نے ہمیں عالمگیریت کا درجہ عطا کیا ہے اس لئے کہ ہماری ذات کی آگہی علاقائی سرحدوں میں مقید نہیں رہی اور چونکہ ذات بہت سی شناختوں یعنی قومیت، طبقہ، جنس، مذہب، نسل وغیرہ وغیرہ کے حوالے سے بنتی ہے تو پھر یہ فطری عمل ہے کہ جب ان میں سے کوئی ایک (مثال کے طور پر قومیت) ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے تو دوسری (مثال کے طور پر مذہب یا نسل) اس خلا کو پُر کر لے گی۔

گذشتہ صدی میں سیکولر نیشنلزم (قومی ریاست کو مشترکہ شناخت کا درجہ دینا) دنیا کے بیشتر حصوں یہاں تک کہ ترقی پذیر ملکوں میں بھی شناخت کا غالب ثبوت رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ ان ملکوں کے رہنما تناور قومی شناخت کو ملک کی اقتصادی اور سیاسی ترقی کی راہ میں اٹھنے والا پہلا قدم سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نیشنلزم قوم کے تصور سے شروع ہوتا ہے لیکن قوم کیا ہوتی ہے، اس کا تعین آسان کام نہیں ہے۔

اس حوالے سے ایک ممتاز نظریہ ساز انتھونی سمتھ لکھتا ہے ''ایک ہی نسل کے لوگوں پر مشتمل گروہ کو قوم کہا جاتا ہے۔ ان کی اقدار، روایات، داستانیں اور تاریخی یادداشتیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور عام طور پر یہ اپنے آباؤ اجداد کے دیس سے جذباتی طور پر جڑے ہوتے ہیں وہ دیس یا وہ زمینیں یا جگہیں جہاں ان کے بزرگ، ان کے گرو اور ہیرو رہتے رہے، کام کرتے رہے، مذہبی فرائض انجام دیتے رہے اور جہاں وہ لڑتے رہے، وہ ان کا ملک ہوتا ہے، وطن ہوتا ہے، دیس ہوتا ہے''۔ ریاست نام ہے نوکر شاہی کے نظام کا (مثال کے طور پر حکومت) جس کا وجود زمینی سرحدوں کے اندر بسنے والی قوم کو منظم کرنے اور قابو میں رکھنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ ریاست کی سرحدیں ہوتی ہیں اور ان کی جغرافیائی طور پر نشاندہی کی گئی ہوتی ہے۔ قوم بغیر سرحدوں کے ہوتی ہے۔ یہ ایک ''تصوراتی گروہ'' ہوتا ہے۔ قوم کی یہ تعریف بنی ڈکٹ اینڈرسن نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''قوم کی سرحدیں صرف یہ ہوتی ہیں کہ کون اس کا حصہ ہے اور کون حصہ نہیں ہے۔''

ریاست میں رکنیت کا تعین شہریت کے حوالے سے ہوتا ہے لیکن کسی قوم کی رکنیت کیلئے کچھ اور پیمانے بھی ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ارکان کی روایات ایک جیسی ہوں، وہ ایک ہی زبان بولتے ہوں، ان کا ایک ہی خدا ہو یا ان کی رسوم ایک جیسی ہوں۔ جدید ریاست کا تصور اٹھارہویں صدی میں سامنے آیا۔ تاہم قوم کا تصور تب سے موجود ہے جب انسانوں نے خود کو خاندان، گروہ اور قبائل کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا۔ رومنوں سے پہلے مغربی یورپ سے آ کر قدیم برطانیہ میں آباد ہونے والے ایرانیوں، یہودیوں اور عرب لوگ، جو ''قوم'' کی تعریف میں آتے ہیں، کے ہاں اجتماع کا شعور تھا اور انہوں نے مختلف ریاستوں میں جذب ہونے کے باوجود اپنے آبائی وطن سے رابطے قائم رکھے۔

خیالی یا حقیقی دونوں حوالوں سے قوم کو اگر تاریخی روایت یا حکایت کے طور پر دیکھیں تو یہ نسل در نسل انسانی حافظوں میں محفوظ رہتی ہے۔ ریاست اس حکایت یا روایت کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے یکجا یا اسے باندھے رکھتی ہے اور یوں ایسی کتاب تیار ہوتی ہے جو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم قومی ریاست کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم ایک نسبتاً نئے تصور کی بات کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قوم یعنی مشترکہ نسل کی کمیونٹی کو علاقائی سرحدوں یا حکومتی حدوں کے اندر محدود رکھا جا سکتا ہے اور جب ہم سیکولر قوم پرستی کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ قومی ریاست کے ارکان کو مذہب یا نسل کے حوالے سے یکجا رکھنے کی بجائے انہیں سماجی ضابطے میں باندھ کر اس طرح رکھا جائے کہ وہ خود کو آزاد محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ برابری کے احساس سے بھی سرشار ہیں۔

جب خودمختار اور علاقائی حد بندی پر مشتمل قومی ریاست کا وجود عمل میں آیا جس میں رہنے والے لوگ کسی حد تک مشترکہ ثقافتی ورثے کے مالک تھے، جیسا کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں تھا، تو اس وقت سیکولر قوم پرستی نے زور پکڑا۔ لیکن گلوبلائزیشن نے سب کچھ تبدیل کر دیا ہے۔ نیو یارک، پیرس، ایمسٹرڈم، لندن اور ہانگ کانگ جیسے بڑے بڑے شہروں کے وجود میں آنے، بڑے پیمانے پر ہونے والی نقل وطن کے عمل، دوہری شہریت، مختلف لیکن جڑی ہوئی شناختوں، ریاستی سرحدوں کے آر پار لوگوں کی بے دھڑک نقل و حرکت، ان سب نے علاقائی حدوں کے اندر ثقافتی یک رنگی جیسے تصور کو تقریباً ناممکن بنا دیا ہے۔ جیسے جیسے دنیا علاقائی حد بندیوں کی جکڑ بندی

سے آزاد ہو رہی ہے، مشترکہ شناخت کے مرکزی نکتہ کی حیثیت سے نیشنلزم اپنا مقام کھوتا جا رہا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی قصے کو کتاب کی جلدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا، بالکل اسی طرح گلوبلائزیشن نے اس تصور کو جھٹلا دیا ہے کہ کسی قوم کو ریاست کی جغرافیائی حدوں کے اندر رکھا جا سکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابتداء ہی سے سیکولر نیشنلزم ایک متزلزل تصور تھا۔ یہ تصور یورپ میں ہونے والے اجتہاد کے بعد کے زمانے میں پیدا ہوا، یورپ میں روشن خیالی کے دور میں اس کی پرورش ہوئی اور پھر فتوحات اور نو آبادیاتی نظام کے ذریعے دنیا کے بقیہ حصہ میں اسے ایک طے شدہ طریقے کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ ترقی پذیر دنیا کے بڑے حصے میں قومی ریاست ایک غیر ملکی تصور سمجھا جاتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ تبدیل ہو چکا، سرحدوں کی کاٹ پیٹ کر کے نئی ریاستیں وجود میں لائی گئیں، ان کو نئے نام دیئے گئے اور مصنوعی قومیتوں کو وجود دیا گیا اور یہ سارا کام نو آبادیاتی آقاؤں نے انجام دیا۔ اس خطے میں نیشنلزم کبھی بھی اجتماعی شناخت کا بنیادی نکتہ نہیں رہا۔ بہت سے سوڈانی خود کو سوڈانی نہیں کہلواتے۔ روانڈا کے لوگوں کی شناخت ریاست کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کے قبیلے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ سکھوں کی ایک بڑی تعداد چاہے ان کی شہریت کہیں کی بھی ہو، یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا ملک خالصتان ہے۔ کُرد کبھی سرحدوں کے اندر رہنے والی آبادی بننا پسند نہیں کرتے اور عراق افسانوی ریاست ہے جس کی بنیادیں داستانوں اور ان لوگوں کی یادداشتوں پر رکھی گئی ہیں، جن کے ساتھ جدید عراق کے لوگوں کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان ملکوں میں، ان ''قوموں'' میں شہریت محض کاغذ کا ٹکڑا ہے اور جیسا کہ ایک سو سال پہلے ایڈمنڈ برک نے کہا تھا کہ افراد کو دستاویزات اور ان پر لگی مہروں کے ذریعے باندھ کر نہیں بلکہ مشابہت، مشترکہ عقیدے اور موافقت کی بنیاد پر اکٹھا رکھا جا سکتا ہے۔

خود یورپ اور ترقی یافتہ دنیا میں سیکولر نیشنلزم کا تصور مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قومی ریاست کی رکنیت یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کی شہریت کیلئے لازمی ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر ریاست کی حکمرانی کو تسلیم کیا جائے۔ میکس ویبر کا یہ مشہور مقولہ، کہ ریاست ایک ایسا وجود ہوتی ہے جو طاقت کے جائز استعمال پر اجارہ داری رکھتی ہے، مطلق اختیارات کی ناقص کیفیت کے بیالیے سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں رہا۔ یہ کیفیت آزاد اور بہت زیادہ لبرل قومی

ریاستوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جدید ریاست صرف طاقت پر ہی نہیں بلکہ شناخت پر بھی مکمل اجارہ داری رکھتی ہے۔ یہ سماجی زندگی کی ہر سطح پر بے حد محتاط کنٹرول قائم رکھتی ہے۔ یہ انسانی نقل و حرکت اور چال چلن پر کنٹرول رکھنے والی ابتدائی انسدادی قوت ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کو بتاتی ہے کہ کون سا مذہبی یا سیاسی اظہار صحیح ہے یا غلط۔ یہ ہر قسم کی سماجی، جنسی اور روحانی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے فیصلوں پر اتفاق رائے مانگتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ریاست ہی فیصلہ کرتی ہے کہ ریاست کی تیار کردہ مشترکہ شناخت پر کون پورا اترتا ہے اور کون پورا نہیں اترتا۔ زندگی اور موت پر ریاست کی اجارہ داری حرف آخر ہے اور ان سے گریز ناممکن ہے۔

ویسے کسی قوم کے تمام باشندے ریاست کو اس بات کی اجازت دینے پر رضامند نہیں ہوتے کہ ریاست ان کو سرحدوں میں محصور کر دے۔ چاہے انہیں لوگوں، مذہب، ثقافت کا نام دے لیجئے، ریاست ان سب پر یکساں قسم کی شناخت ٹھونستی ہے۔ بہرحال ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ایک ہی مذہبی عقیدہ اور مشترکہ ثقافت رکھنے کے باوجود خود کو اس جغرافیائی حد بندی میں محدود رکھنے پر تیار نہیں ہوتے۔ دنیا کے تمام خطوں میں خاندان، قبیلہ، نسل اور مذہب کے ساتھ وفاداریاں ریاست کے ساتھ وفاداری سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ اب جبکہ گلوبلائزیشن نے ہماری شناختوں پر سیکولر قوم پرستی کی گرفت کو کمزور کرنا شروع کر دیا ہے تو لوگ پھر سے شناخت کی پرانی اور ابتدائی شکلوں یعنی مذہب اور نسل پرستی کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئے ہیں اور شناخت کی ان پرانی اور ابتدائی شکلوں پر ریاستی مشینری با آسانی قابو نہیں پا سکتی۔

سابق یوگوسلاویہ کی توڑ پھوڑ کو دیکھ لیجئے۔ یوگوسلاویہ کے تمام لوگ پہلے ایک ہی قسم کی شہری شناخت رکھتے تھے لیکن انہیں مجبور کر دیا گیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی نسلی طور پر ایک جیسی ریاستوں میں تقسیم ہو جائیں۔ اب صورت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ریاست دوسری کے ساتھ متصادم ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب کثیر القومی شناختیں (اس معاملے میں نسلی امتیاز) قومی وفاداریوں سے متصادم ہوتی ہیں تو ایسے ہی حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اردو بولنے والے مغربی پاکستان اور بنگالی بولنے والے مشرقی پاکستان کے درمیان اسی قسم کی کشیدگی پیدا ہونے کے سبب یہ ایک ملک دو ریاستوں پاکستان اور بنگلہ دیش میں تقسیم ہو گیا۔ لیکن جب معاملہ کثیر القومی شناختوں کی طرف سے قومی شناختوں کو چیلنج کا ہو تو پھر اس میں سب سے زیادہ مستحکم قوت مذہب

ہوتی ہے۔

الفتح نے یہ سچائی مشکل حالات میں سے گزر کر پائی۔ یاسر عرفات کی پارٹی نے اپنی سیاست کا آغاز مصر اور اردن میں زیر زمین متحرک فلسطینی گوریلا گروپوں کے طور پر کیا لیکن اس نے تھوڑے ہی وقت میں فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور پی ایل او فلسطینی قوم کے مفادات کی نمائندہ تنظیم بن گئی۔ الفتح کی بنیادی کامیابی اس کی وہ اہلیت تھی جس کے باعث اس نے مختلف اور ایک دوسرے کے مخالف فلسطینی سیاسی گروہوں کو ایک واحد سیکولر قومی شناخت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم یہی قوت یعنی سیکولر نیشنلزم، جس نے الفتح کو پچھلی صدی کی ساٹھویں اور ستر ہویں دہائیوں میں فلسطینی سیاست میں بلند ترین مقام عطا کیا، آہستہ آہستہ اس کے زوال کا باعث بنی۔ (بہر حال اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس زوال میں الفتح کے متعدد رہنماؤں کی کرپشن نے بھی کردار ادا کیا)۔ 1988ء میں، فلسطین پر بیس سالہ پرتشدد قبضہ کے بعد، فلسطینی عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور اس عوامی بغاوت کے نتیجے میں اسلامی مزاحمتی تحریک، حماس کے نام سے سیاسی منظر پر نمودار ہوئی۔ الفتح کے سیکولر نیشنلزم کے فلسفہ کے خلاف حماس نے اپنے سیاسی پلیٹ فارم کو خصوصی طور پر مذہبی رنگ دیا۔ اس نے نئی مشترکہ شناخت پیدا کرنے کے لیے اسلام کی معروف اور جانی پہچانی علامتوں اور اصلاحات پر تکیہ کیا۔ یہ وہ شناخت تھی جس کے ذریعے، تمام ثقافتی اور طبقاتی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے اسرائیل کے خلاف مزاحمت کے لیے فلسطینی عوام کو متحد کر کیا جا سکتا تھا۔

مسلم دنیا میں مذہب اور نیشنلزم کی آمیزش کو ''اسلام ازم'' کہا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کی ابتداء بعد از نو آبادیاتی مصر اور ہندوستان میں ہوئی۔ اسلام ازم ایک سیاسی فلسفہ ہے جس کا مقصد نچلی سطح پر موجود سماجی اور سیاسی تحریک یا پرتشدد انقلاب کے ذریعے ایسی اسلامی ریاست قائم کرنا ہے جس کی بنیاد واضح طور پر اسلام کی اخلاقی حدود پر استوار ہو۔ کچھ اسلامی گروہ جیسا کہ مصر کا مسلم برادر ہڈ، اردن کا اسلامک ایکشن فرنٹ، ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اے کے پی) اور الجزائر کا فرنٹ اسلامک دوسالو (ایف آئی ایس)، سماجی تبدیلی کے عمل میں، عوامی شرکت پر یقین رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسرے گروہ جن میں افغانستان کے طالبان، مصر کے اسلامی جہادی اور الجزائر کا آرمڈ اسلامی گروپ (جی آئی اے) شامل ہیں فوجی بغاوت کے ذریعے حکومتوں کا

خاتمہ کرنے کی خواہشیں رکھتے ہیں۔

مذہبی قوم پرستی (نیشنلزم) کسی بھی حوالے سے محض اسلامی عمل نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ الفتح اور حماس (سیکولر اور مذہبی نیشنلزم) کے درمیان ہونے والی سول وار ایک ایسی جنگ ہے جو پوری دنیا میں اور تقریباً ہر بڑے مذہب میں جاری ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سیکولر نیشنلزم کو جس میں قومی ریاست کو مشترکہ شناخت کا مرکز سمجھا جاتا ہے، شعوری طور پر مذہب کے متبادل کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں نیشنلزم کی کامیابی کی وجہ اس کی وہ اہلیت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کے لئے الفاظ ''اختیار'' اور مذہبی اداروں کے وسائل کو اپنا لیتے ہیں شاید یہ ناگزیر تھا اس لئے کہ سیکولر نیشنلزم میں جب توڑ پھوڑ شروع ہوتی ہے تو مذہب ایک بار پھر مشترکہ شناخت کا مرکزی نکتہ بن جاتا ہے لیکن ایسی صورت میں اس میں تشدد کا عمل شامل ہو جاتا ہے۔

مذہبی نیشنلزم کا مسئلہ اس کی خواہشات اور آرزوئیں نہیں جو بہت سے معاملات میں معاشرے کے جسم میں خاص قسم کی اقدار اور رسم و رواج کو داخل کرنے سے کہیں زیادہ کا عمل ہے مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی شناختوں کو قومی ریاست کے کھونٹے سے نہیں باندھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سلامتی کو درپیش سب سے بڑا خطرہ تیزی کے ساتھ ابھرتی ہوئی مذہبی نیشنلزم ہے، جو جمہوریت میں ناگزیر ہو سکتا ہے، لیکن اسے اگر موقع دیا جائے تو امکان ہے کہ یہ عمل ایک پختہ اور ذمہ دارانہ نظام حکومت کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ترکی کی اے کے پی یا اس حوالے سے یورپ کی متحدہ کرسچین نیشنل جماعتوں کے ساتھ ہوا۔ عالمی امن اور سلامتی کو اصلی خطرہ کثیر القومی مذہبی تحریکوں سے ہے جنہیں ان کی علاقائی سرحدوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا اور ان سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تنظیمیں ہیں جن کی بنیادیں عسکری اسلامی شریعت پر رکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بدنام تنظیم القاعدہ ہے جو عالمی سطح پر جہاد کا درس دیتی ہے۔

جہادازم، جسے عربی میں جہاد یہ کہا جاتا ہے، کے لفظی معنی اور اس کے برتاؤ اور استعمال کے بارے میں خاصا الجھاؤ ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ موقع پرست سیاستدانوں کی طرف سے اس کا غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو امریکہ مخالفوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں یا لاپرواہ اور بے خبر میڈیا اس کا استعمال ایسے کرتا ہے کہ لاعلم لوگ بے حد خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر مسلمان اس اصطلاح کے استعمال پر خفا ہیں۔ ان کا کہنا ہے (اور ان کا کہنا صحیح ہے) کہ

القاعدہ اور اس جیسے دوسرے شدت پسند جہاد کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ صدیوں پرانے تصورِ جہاد کے بالکل الٹ ہے اور اس کا اسلام کے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عربی میں جہاد کے لفظی معانی ہیں ''جدوجہد'' (یہ فعل جہادہ سے لیا گیا ہے اور اس کا مطلب ہے کسی مقصد کیلئے محنت اور مشقت کرنا) اور قرآن میں 'اللہ کے راستے میں'' کے حوالے سے استعمال کیا گیا ہے۔ جہاد کا مطلب ہے اپنی انا کے خلاف اپنے نفس، اپنی جبلت اور تحریص کے خلاف جدوجہد کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی روح کو کچل دیتی ہیں۔ سماجی انصاف کے مذہب میں جہاد ایک اندرونی جدوجہد ہے جس کے معانی کو اپنے مفادات کی روشنی میں قبضے کے خلاف، انتشار اور شہری زندگی میں افتراق کے خلاف اور اندرونی و بیرونی دشمنان اسلام اور بے عقیدہ لوگوں کے خلاف جدوجہد تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

جہادیوں کے نزدیک جہاد کا نظریہ اس اصطلاح کے روائتی معانی سے ماوراء ہے اور عبودیت کا درجہ رکھتا ہے۔ بن لادن کے لفظوں میں جہادی تحریک ''جہاد کو متحرک اور مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا حصہ بنانے کی خواہش رکھتی ہے۔ یہ اسے عبادت کا درجہ دینا چاہتی ہے''۔ کشمیر کی جہادی تنظیم جیش محمد کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کے مطابق جہاد ''واحد صالح عمل ہی نہیں بلکہ یہ تمام دوسرے اعمال کا محافظ بھی ہے''۔ اسلام عقیدے کی جن بنیادوں پر قائم کیا گیا اور جن پر عمل درآمد لازمی قرار پایا، وہ ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عقیدے کا اظہار۔ لیکن یہ تمام لوازم جہاد کے بغیر نامکمل رہتے ہیں اور نجات کا واحد ذریعہ جہاد ہے۔ جدید جہادی نظریے کے خالق عبداللہ عظام لکھتے ہیں کہ ''آج کے دور میں جو شخص جہاد نہیں کرتا وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برت رہا ہے۔ بالکل اس شخص کی طرح جو ماہ رمضان کے دوران کسی معقول وجہ کے بغیر کھاتا پیتا ہے یا کوئی امیر آدمی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح جو شخص جہاد ترک کر دیتا ہے، وہ لائق تعزیر ٹھہرتا ہے''۔ عظام نے اعلان کیا ہے کہ نہ تو قرآنی آیات کی تلاوت، نہ فرمان الٰہی پر رضامندی، نہ عبادت گزاری، نہ قانون پر عمل درآمد اور نہ ہی روحانی مقصد وہ پیمانے ہیں، جو کسی کو مسلمان قرار دینے کی کسوٹی بنتے ہیں بلکہ جہاد اور رائفل ہی کسی کے مسلمان ہونے کی بنیاد بنتے ہیں۔

جہاد پر سختی سے کھڑے رہنے کے باوجود، عالمی جہاد، مذہبی تحریک کم اور سماجی تحریک زیادہ ہے۔ ایسی سماجی تحریک جو سرحدوں اور حدوں کے آر پار مشترکہ تشخص قائم کرنے کیلئے مذہبی

علامتوں کو استعمال کرتی ہے۔ تاریخی طور پر جہادازم کی جڑیں حضرت محمد ﷺ کے دور میں نہیں ہیں بلکہ اس کا تعلق بیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کے مخالف حسن البناء اور سید قطب سے ہے۔ یہ جہادازم کے اصولوں کی بنیاد قرآن پاک پر نہیں رکھتے بلکہ تیرہویں صدی کے ماہر قانون احمد ابن تیمیہ کی تحریروں کو بنیاد بناتے ہیں۔ یہ حماس یا حزب اللہ جیسے عسکریت پسند قوم پرست گروپوں کی نسبت بولشویک اور فرانسیسی انقلابیوں کی تحریک سے زیادہ مماثل ہے۔ جہادازم کو اسلامی فاشزم کا نام دینا جہادازم اور فاشزم کو غلط طور پر سمجھنے کے مترادف ہے۔ فاشزم انتہا پسند قوم پرستی کا نظریہ ہے جبکہ جہادازم قومی ریاست کے نظریہ کو سراب قرار دے کر رد کرتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو جہادازم، اسلام ازم کے الٹ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جہاز ازم کو عمومی طور پر جدت مخالف سمجھا جاتا ہے۔ جہادازم جدت پسندی کو رد نہیں کرتا۔ یہ تو بذات خود جدت پسندی کی تخلیق ہے۔ تاہم یہ مغربیت کی نفی کرتا ہے، اسے رد کرتا ہے، چونکہ ''جدت پسندی'' اور ''مغربیت'' بڑے پیچیدہ طریقے سے جڑے ہوئے ہیں (زیادہ تر مغربی دنیا میں) اس لئے جو کوئی ان میں سے ایک کو رد کرتا ہے، اسے دوسرے کا بھی مخالف سمجھ لیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ جہادازم جدید دنیا کا متبادل ہو لیکن اس کا ماخذ وہ تصورات ہیں جن کا جوہر جدیدیت ہے۔ برطانیہ کے سیاسی فلسفہ دان جان گرے نے اسے اس مرض کی علامت قرار دیا ہے جو خود کو مرض کا علاج قرار دیتی ہے۔

جہادازم روایت پرستی نہیں ہے۔ جہادی نظریہ ساز خود کو اسلام کے روایتی نظریے سے فاصلے پر رکھتے ہیں۔ اس تحریک کے اندر اسلامی حکومت یا عمل داری کی مکمل نفی موجود ہے اور اسلامی قانون سے مکمل بے اعتنائی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں مسجدوں اور مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان مسلمانوں پر انتہاء پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن یہ مفروضہ اس ہولناک معاشرتی تبدیلی کو نظر انداز کر دیتا ہے جو عرب اور مسلم دنیاؤں میں گذشتہ صدی کے دوران گلوبلائزیشن کے عمل سے وجود میں آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ خواندگی کی شرح میں تیزی کے ساتھ ہونے والے اضافے، نئے متعارف ہونے والے علوم اس تبدیلی کا باعث بنے۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ جیسی نئی ٹیکنالوجی اس میں مزید وسعت کی وجہ بنی جس سے جہادی رہنماؤں کو روشنی ملی اور انہوں نے اسلام کے روایتی ملّائی کردار کو ایک طرف کر دیا اور دنیا بھر کے

مسلمانوں تک اپنا انفرادی اور غیر روائتی پیغام پہنچایا۔

جہاد کا نیا نظریہ اسلام کی پرانی روایت سے ہٹ کر ہے۔ صدیوں تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ ایک سلطنت یا ریاست کی حدود میں رہتے ہوئے زندگی، عقیدے اور جائیداد کے تحفظ کیلئے لڑنا مشترکہ فرض ہے (اللہ کے لئے ان کے خلاف لڑو جو تم سے لڑتے ہیں''۔ قرآن ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ''لیکن خود جنگ کی شروعات نہ کرو، اس لئے کہ اللہ جارح کو پسند نہیں کرتا''۔ ۲:۱۹۰) لیکن جہادازم میں یہ معاملہ انفرادی فریضہ قرار دے دیا گیا ہے جو کسی ادارے کی قوت یا اختیار سے بالکل الگ ہے (یمنی شیخ ربیع المدخالی جہادی کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ وہ شخص جہادی ہے جو جنگ کرنا اپنا انفرادی فریضہ سمجھتا ہے)۔ بلاشبہ جہادازم کا بنیادی مقصد جہادی نظریے کو تمام سیاسی یا مذہبی اداروں سے الگ رکھنا ہے تاکہ یہ صرف اور صرف اخلاقی ذمہ داری تک محدود رہے۔ قرآن پاک کے کلاسیکی فہم کے مطابق یہ جارحیت کے خلاف جدوجہد نہیں ہے (''صرف ان لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت ہے جن پر جارحیت کی گئی ہے''۔ ۲۲:۳۹) یہ بالکل مختلف بات ہے۔ یہ شناخت کی صورت میں جہاد ہے جو تمام سیاسی اغراض سے ہٹ کر محض ایک مافوق الفطرت جدوجہد ہے۔

یہ جہاد کائناتی جنگ ہے۔

ویسٹ پوائنٹ پر موجود کومبٹینگ ٹیررازم سینٹر کے ڈائریکٹر جیرٹ پراچمین کے مطابق عالمی قوت کے طور پر جہادازم کی موجودہ شکل ۲۰۰۳ء میں سامنے آئی۔ اگرچہ اس کی جڑیں بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والی اسلامی احیاء کی تحریک میں تھیں جو سلافزم کے نام سے جانی جاتی ہے۔ (اصطلاح سلف حضرت محمد ﷺ کے ابتدائی ساتھیوں کے ساتھ موسوم ہے)۔ سلافزم مصر اور ہندوستان میں ایک ترقی پسند تحریک کے طور پر شروع ہوئی جس کے ارکان روایتی اسلامی نظریے میں اصلاح کے خواہاں تھے اور اسلام کو روشن خیال نظریہ حیات کے طور پر دیکھتے تھے۔ اسی تحریک کی بنیاد بیسویں صدی کے دو انتہائی نامور مسلمان دانشوروں جمال الدین افغانی (ایرانی دانشور جنہوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز ہندوستان سے کیا تھا) اور مصری اصلاح پسند محمد عبدہٗ کی تحریروں پر رکھی گئی۔ ان دونوں دانشوروں کا ماننا تھا کہ نوآبادیاتی نظام اور مغرب کی ثقافتی حاکمیت سے مسلمان ملکوں کو نجات دلانے کا واحد راستہ اسلام کا احیاء ہے۔ یہ ''جدت پسند''

ملائیت کے قواعد وقوانین کے محافظ علماء'' کو مسلمان معاشرے کی اس پستی کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ انہوں نے ملاؤں کو اسلام کے واحد شارحین ماننے سے انکار کرتے ہوئے قرار دیا کہ قرآن اور حدیث کو پڑھنا اور انہیں سمجھنا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے۔

اس وقت سلفی تنظیموں میں سب سے زیادہ کامیاب تنظیم ''مسلم برادر ہوڈ'' تھی جسے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مصر کے سکول ماسٹر حسن البناء نے قائم کیا۔ مسلم برادر ہوڈ نے معاشرے کی نچلی سطح پر ایک سماجی تحریک کی صورت میں کام شروع کیا جس کا مقصد مذہبی فلاح اور تعلیمی پروگراموں کے ذریعے سماج کو بتدریج اسلامی شکل دینا تھا۔ البنا کا ماننا تھا کہ صحیح اسلامی ریاست قائم کرنے کا واحد طریقہ تبلیغ اور نیک کام ہیں تشدد اور مسلح بغاوت کے ذریعے یہ ممکن نہیں۔ (یاد رہے کہ ان کے زمانے کے کچھ اسلام پسند قائدین تشدد اور مسلح بغاوت ہی میں یقین رکھتے تھے) جمال الدین افغانی یا محمد عبدہٗ نے اسلام کی جو تشریح کی ہے، اگرچہ البناء اس حوالے سے ان دونوں دانشوروں کی تشریحات کے حوالے سے زیادہ قدامت پسند تھے، تاہم وہ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلامی احیاء کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ''علماء'' ہیں۔ جو خصوصاً مصر کی مشہور الازہر یونیورسٹی کے، جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ادارہ ہے اور جو ایک ہزار سال قبل قائم کی گئی تھی، اور اس کے سینئر اساتذہ، جن کی وجہ سے الازہر یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ویٹی کن کا درجہ اختیار کر گئی۔ کچھ فارغ التحصیل تھے۔ حقیقت میں البناء نے مسلمانوں کو ''حصول علم کا ایک متبادل ذریعہ مہیا کرنے کیلئے ''مسلم برادر ہوڈ'' قائم کی تھی۔ ایک ایسا ادارہ جو اصلاح پسندانہ نکتہ نظر کو آگے بڑھائے اور مسلمانوں کو سماجی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے اس راستے پر لے جائے جو الازہر کے ملاؤں کے بتائے گئے راستوں سے الگ ہو۔

۱۹۴۹ء میں جب حسن البناء فوت ہوئے تب تک مسلم برادر ہوڈ مصر کی سب سے مقبول سماجی تحریک بن چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالمی سطح پر مسلم امّہ کی واحد اور مضبوط ترین تنظیم ''مسلم برادر ہوڈ'' تھی جس کی شاخیں شام، اردن، فلسطین اور لبنان میں تحریک کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں جب کرنل جمال عبدالناصر کی قیادت میں مصر کے فوجی افسروں کے ایک گروہ نے مصر کے شاہ فاروق، جسے برطانیہ کی پشت پناہی حاصل تھی، کے خلاف بغاوت کی تو مسلم برادر ہوڈ نے عوامی سطح پر ناصر کی بغاوت کی حمایت کی اور انقلاب کے بعد نئی

انقلابی حکومت کا بھرپور ساتھ دیا۔شروع میں تو ناصر نے برادر ہوڈ کا خیر مقدم کیا اور اس کے ارکان کو ملک کی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد برادر ہوڈ کے ایک رکن کی طرف سے ناصر کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کے نتیجے میں ناصر نے برادر ہوڈ کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اس کے رہنماؤں کو جیل بھیج دیا۔

جیل میں برادر ہوڈ متحارب گروپوں میں بٹ گئی۔متحرک لوگوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی جس کی قیادت مصر کی کرشماتی شخصیت سید قطب، جو ایک استاد تھے، کر رہے تھے۔انہوں نے حسن البناء کی سماجی تحریک کو ایک ایسی انقلابی قوت میں تبدیل کر دیا جس کا مقصد زمین پر ''اللہ کی بادشاہت قائم کرنا اور انسان کی بادشاہت'' ختم کرنا ٹھہرا۔قطب کی دلیل یہ تھی کہ ناصر (اور درحقیقت تمام عرب رہنما) کو اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں مانا جا سکتا جب تک وہ سختی کے ساتھ اسلامی قانون (شریعت) کو نافذ نہیں کرتا اور چونکہ وہ ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اس لئے وہ دین کا منحرف ٹھہرا، کافر ٹھہرا اور اس کی سزا موت ہے۔قطب نے یہاں تک کہا کہ ناصر کی قیادت کو ماننے والا بھی کافر ہوگا۔''وہ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن مختلف قسم کے مظالم کے خلاف جہاد نہیں کرتے یا مظلوموں کے حقوق کا دفاع نہیں کرتے یا آمر کے سامنے چلاّتے نہیں، وہ یا تو غلط لوگ ہیں یا وہ منافق ہیں یا پھر وہ اسلام کے دینی فرائض سے ناواقف ہیں۔'' قطب نے اعلان کیا۔

ناصر نے ۱۹۶۶ء میں قطب کو پھانسی دے دی لیکن اس وقت تک قطب کا اثر و رسوخ مسلم برادر ہوڈ کی صفوں میں پھیل چکا تھا اور یوں سلفیہ تحریک انتہا پسندی کے عروج تک پہنچ گئی۔اپنی جانوں کے خوف سے قطب سے متاثر سلفی اور مسلم برادر ہوڈ کے انتہائی پسند ارکان نے اپنے ملکوں یعنی مصر، شام، اردن اور فلسطین سے بھاگ کر اپنے لئے محفوظ ملک سعودی عرب میں پناہ لی۔لیکن یہاں انہیں وہابیت جیسی انتہائی قدامت پسند تحریک کا سامنا کرنا پڑا۔

وہابیت کی بنیاد مشرقی سعودی عرب کے بنجر ریگستان کے شہر نجد میں پڑی۔وہابی اپنے لئے مواحدین کی اصطلاح پسند کرتے تھے۔مواحدین کا مطلب وحدت پرست ہے۔یہ ایک انتہائی عسکریت پسند تحریک تھی جسے محمد ابن عبدالوہاب نے اٹھارہویں صدی کے نصف میں قائم کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ غیر اسلامی اعتقادات اور اعمال نے اسلام کی پاکیزگی کو گندہ کر دیا ہے۔ان غیر اسلامی اعتقادات اور اعمال میں بزرگوں سے دعائیں مانگنا اور ان کے مزاروں پر جانا شامل تھا۔

عبدالوہاب تمام ثقافتی، نسلی اور مذہبی اختراعات کو (جنہیں وہ بدعت کہتے تھے) ختم کرنا چاہتے تھے تاکہ عقیدے کو اس کی اصل اور عرب ماخذ کے مطابق شکل دی جا سکے۔

۱۹۳۲ء میں جب تیل دریافت ہوا تو جزیرہ نما عرب کا زمینی اور سماجی منظرنامہ تبدیل ہو گیا۔ وہابیت کو سعودی عرب کی مملکت کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک پہنچتے پہنچتے یہ مملکت دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہونے لگی۔ مکہ اور دوسرے شہروں میں روایتی عمارتوں کی جگہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی جدید ترین عمارتوں نے لے لی۔ سعودی عرب کا مغربی شہر جدہ کاروبار اور مالیات کے حوالے سے بین الاقوامی مرکز بن گیا۔ اپوزیشن کو (خصوصاً مذہبی اپوزیشن) کو دبائے رکھنے کیلئے سعودی حکومت نے اپنے مقاصد اور اقدامات کے حق میں وہابی ملاؤں سے فتوے لینے شروع کر دیئے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل کے نوجوان خود کو دنیا سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگے۔ جو جدہ اور دوسرے بڑے شہروں کی مغربی جدت سے متاثر تھے، حکومت کے تکلیف دہ احکامات کے باعث سماجی سطح پر خود کو غیر اہم سمجھنے لگے تھے، وہ روایتی مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں میں سے پھسلنے لگے اور یوں وہ قطبیوں اور سلفیوں کے ہاتھوں میں چلے گئے اور اس طرح ان تنظیموں نے سعودی عرب کے دانشور حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ سلفیوں اور وہابیوں کے اس ملاپ یعنی اسلامی سیاسی تحرک نے نوجوان مسلمانوں کی ایک نئی، انتہا پسند، رجعت پرست اور تشدد آمیز اصطلاح ''جہادیت'' کو جنم دیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جہادیت (جہادازم) ایک اور اسلامی تحریک کے طور پر شروع ہوئی جس کا مقصد ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ جہادیت کے بارے میں ممتاز امریکی دانشور فواد جرجس کا کہنا ہے کہ ابتداء میں جہادی مذہبی قوم پرست تھے جن کا بنیادی مقصد ان کے اپنے سماج میں انقلابی تبدیلی لانا تھا۔ ان کا پہلا نشانہ عرب حکومتیں، منافق امام، منحرف مسلمان تھے جنہیں وہ قریبی دشمن کہتے تھے اور جنہیں وہ ''دور کا دشمن'' قرار دیتے تھے وہ تھے اسرائیل، یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ ایمن الظواہری نے ۱۹۵۵ء میں لکھا کہ ''یروشلم کو راستہ قاہرہ سے ہو کر جاتا ہے''۔ یاد رہے کہ اس وقت تک الظواہری نے القاعدہ میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی اور وہ اس وقت تک صرف ایک پرجوش اسلام پسند تھے اور ایک مذہبی قوم پرست تنظیم ایجی ٹیشن اسلامی جہاد (ای آئی جے) کے سربراہ تھے۔

بیسویں صدی کی اسّی اور نوّے کی دہائیوں کے دوران الظواہری اور ان کے جہادی پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد نے اپنا نشانہ تبدیل کرنا شروع کیا یعنی اب ان کے نشانے پر ''قریبی دشمن'' کی بجائے ''دور کا دشمن'' آ گیا۔ یوں کہہ لیجئے کہ ان کا رخ محدود وطن پرستی کی بجائے گلوبلزم کی طرف ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسلام ازم کے ذریعے انقلاب برپا نہ ہو سکا تھا جس کا وعدہ وہ ایک عرصے سے کرتے چلے آئے تھے۔ عرب دنیا میں مذہبی قوم پرستی کو تشدد کے ذریعے کچل دیا گیا جس سے اسلام پسندوں کی تحریک کو شدید نقصان پہنچا۔ الجزائر میں اس وقت فوج نے پارلیمانی انتخابات کو منسوخ کر دیا جب نظر آ رہا تھا کہ اسلام پسندوں کی سیاسی جماعت ''فرنٹ اسلامک ڈوسالُو'' (ایف آئی ایس) انتخابات میں اکثریت حاصل کر لے گی۔ ایف آئی ایس کے جمہوری انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے نے اسلامی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی چنانچہ اس پر فوری طور پر پابندی لگا کر غیر قانونی قرار دے کر اس کے قائدین کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں خوفناک سول وار شروع ہو گئی جس میں تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے۔ اس سے یہ ہوا کہ الجزائر میں آرمڈ اسلامک گروپ یا جی آئی اے جیسے تبدیلی چاہنے والے اسلامی گروپوں نے یہ سمجھ لیا کہ سیاسی عمل میں شرکت کرنا فضول اور بے مقصد کارروائی ہے۔ اس دوران کو مبیٹنٹ وین گارڈ، جو مسلم برادر ہوڈ کی ذیلی تنظیم تھی، نے شام کے شہر حماء میں بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ردعمل میں شامی صدر حافظ الاسد نے اس شہر پر بھرپور فوج کشی کا آغاز کر دیا جس میں مسلم برادر ہوڈ کے ہزاروں لوگ مارے گئے اور حما شہر کو مسمار کر دیا گیا۔ القاعدہ کے نظریہ ساز ابو مصعب الصوری نے جو کو مبیٹنٹ وین گارڈ کے رکن تو تھے لیکن باغیوں میں شامل نہیں تھے، اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ''دوسرے واقعات کو ایک طرف رکھئے، مجھے حماء کے قتل عام نے اسلام ازم کی ناکامی کے بارے میں باور کرایا''۔ دریں اثناء مسلم برادر ہوڈ کی مصری شاخ نے اپنی عسکری سرگرمیاں ختم کر دیں اور حکومت کے شدید دباؤ کے تحت، خود کو ایک سیاسی جماعت کی شکل دی تا کہ لڑنے کی بجائے اسٹیبلشمنٹ کو مصروف رکھا جائے۔ سلفی گروپوں نے جو سعودی وہابیت کے اثر میں نہ آئے تھے، مصری مسلم برادر ہوڈ کی پیروی کرتے ہوئے تشدد کی مذمت عوامی سطح پر کی اور تبلیغ اور سماجی بہبود کے کاموں کی طرف اپنا رخ موڑ لیا جو اس تنظیم کے قیام کا بنیادی مقصد تھا۔ تاہم برادر ہوڈ کے برخلاف سلافیوں نے سیاسی میدان میں آنے سے انکار کر دیا۔ بیسویں صدی کی ۹

ویں دہائی کے اختتام تک اولیویئر رائے (Olivier Roy) اور گلز کیپل (Gilles Kepel) جیسے دانشوروں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کیا کہ قابل عمل سیاسی نظریے کے طور پر اسلام ازم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اسلام ازم کی بظاہر ناکامی کے باوجود عالمی سطح پر جہادی تحریک کے پھیلاؤ میں بہت اہم تبدیلی آئی۔ ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روسی غلبہ نے دنیا بھر کے جہادیوں کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ الظواہری اور الصوری جیسے لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے اپنے ممالک میں اسلامی تحریک کی ناکامی کے سبب وہ لوگ تنہائی کا شکار ہو گئے ہیں۔ میدان جنگ میں ایک مشترکہ مقصد کیلئے اکٹھے ہو کر لڑنے کیلئے مصر، سعودی عرب، شام، یمن، فلسطین، الجزائر، سوڈان، تیونس، عراق، پاکستان، اردن، ملائشیا اور انڈونیشیا کے ہزاروں مسلمان جنگجوؤں کی موجودگی نے جہادیوں میں عالمی بھائی چارگی کا احساس پیدا کیا جس کا انہیں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اپنی یادداشتوں میں ناصر احمد البحری، جو بعد میں اسامہ بن لادن کے چیف باڈی گارڈوں میں شامل ہوا، نے لکھا ہے کہ بوسنیا میں لڑنے والے جہادیوں کے درمیان بھی گروہی شناخت کا ایسا ہی احساس پیدا ہوا تھا۔ ''ہمیں ادراک ہوا کہ ہم ایک قوم (امّہ) ہیں جس کا اقوام عالم میں ایک جداگانہ مقام تھا۔ ورنہ مجھے سعودی عرب چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں بنیادی طور پر یمنی ہوں تو پھر مجھے بوسنیا میں جنگ لڑنا پڑی۔ نیشنلزم کا مسئلہ ہمارے ذہنوں سے محو ہو گیا اور ہمیں ایک وسیع سوچ ملی اور وہ سوچ تھی کہ ہم ایک امّہ ہیں''۔

جنگ کے بعد جب جنگجو اپنے آبائی وطنوں میں واپس آئے تو انہیں پتہ چلا کہ اب وہ پہلے جیسے لوگ نہیں رہے۔ بعض کے نزدیک اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد متروک قرار پا چکی تھی۔ ''اسلامی ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد محض علاقائی سطح پر نہیں کی جا سکتی''۔ یہ اعلان عالمگیریت کی سوچ رکھنے والے الظواہری نے دسمبر ۲۰۰۱ء میں کیا اور وہ بھی اس وقت جب انہوں نے اپنے قوم پرست گروپ ''مصری سلامی جہاد'' کا ادغام اسامہ بن لادن کی القاعدہ کے ساتھ کیا۔ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ بوسنیا اور چیچنیا، سوڈان اور صومالیہ کے جہادیوں کو بھی سرحدوں

کے بغیر مستقبل کی جھلک دکھائی گئی جس میں نہ تو قومیت، شہریت، نسل اور زبان کا کوئی عمل دخل تھا اور نہ ہی ان کی کوئی اہمیت تھی۔ انہیں ایسے جہان کی تصویر دکھائی گئی جس کی واحد شناخت مذہب تھا۔ اب ان کی نظریں عالمی تبدیلی پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کی بندوقوں کے رخ دور کے دشمنوں (Far Enemy) کی طرف مڑ گئے تھے۔

ہزاریہ کے اختتام تک اسلام ازم اور جہاد ازم جو آپس میں چچیرے بھائی سمجھے جاتے تھے، موثر طور پر متحارب تحریکوں یعنی ''مذہبی قوم پرستی'' اور ''مذہبی ٹرانس نیشنلزم'' میں تقسیم ہو گئے۔ آج کے دور میں اسلام ازم کو قوم پرست نظریے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جبکہ زیادہ تر جہادی، تمام سرحدوں، تمام قومیتوں کو ختم کر کے درخشندہ ماضی کی مذہبی اشتراکیت میں یقین رکھتے ہیں۔ ایک اسلامی گروہ حزب اللہ کا کوئی عالمی ایجنڈا نہیں ہے۔ اس کے پاس روپیہ پیسہ بھلے ایران سے آئے لیکن ان کا ایجنڈا لبنان کی سرحدوں تک محدود ہے۔ یہی بات مصر کی مسلم برادر ہوڈ تنظیم کے بارے میں بھی ہے جو خود کو خصوصی طور پر قوم پرستانہ نصب العین سے منسلک کرتی ہے۔ اس کے برعکس جہاد ازم قوم پرستی کے تصور ہی کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ تنظیم جتنی قوم پرستی کی مخالف ہے اتنی ہی بین الاقوامیت کی بھی نفی کرتی ہے۔

حماس کے اسلام پسند اپنے پیروکار، ان بچوں کے والدین میں سے منتخب کرتے ہیں جو امّ النصر کے گاؤں میں ڈوب گئے تھے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جو سماجی اور معاشی طور پر بدحالی کا شکار ہوتے اس کے علاوہ وہ مرد و خواتین بھی ان کی تنظیم کا حصہ بنتے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ ایسے گروہوں کے ارکان کا تعلق سماجی، سیاسی یا اقتصادی بدحالی کا شکار ہونے والے لوگوں سے ہوتا ہے۔

جہاد ازم والوں کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اپنے ارکان کا چناؤ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ، مہذب، خوش اخلاق مسلمان نوجوانوں میں سے کرتے ہیں جو مشرقی لندن میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور جنہوں نے انٹرنیٹ پر امّ النصر کے بچوں کی اموات کے بارے میں پڑھا ہوتا ہے۔ یہ نوجوان مسلمان سماجی سطح پر جڑے ہوئے اور سیاسی طور پر متحرک ہوتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ جس

مذہبی شکل کو اسلام سمجھ کر ان کے والدین نے اپنایا ہوا ہے، وہ تصور اسلام آج کی جدید دنیا کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ انہیں انتہائی بدشکل تشدد اور بدنما ناانصافی نے ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے اور انہیں یقین ہے کہ وہ اچھائی اور بدی کے درمیان اس کائناتی جنگ میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اسلام پسند گروہ بعض اوقات گلوبلائزیشن سے خوفزدہ بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اسے اپنی مذہبی شناخت پر مغرب کی طرف سے حملہ سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف جہادازم گلوبلائزیشن ہی کی پیداوار ہے۔ اس کے وجود کا انحصار بغیر سرحدوں کی دنیا پر ہے، وہ دنیا جس کے اندر مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں اور جس کے اندر متبرک اور سیکولر کے درمیان فرق نہیں ہوتا۔ عالمی سطح پر خلافت کو ایک بار پھر رائج کرنے کی مہم میں ''جہادازم'' والے ایسے اسلام کی بات کرتے ہیں جو سرحدوں میں مقید نہ ہو اور جو نسلی اور ثقافتی سرحدوں کے تصور سے پاک ہو۔

تمام جہادی نہ تو عالمگیریت (گلوبلزم) میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی تمام اسلام پسند (اسلامسٹس) خود کو محض قوم پرستی کے معاملات تک محدود رکھتے ہیں (جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے بارے میں جہادی رہنماؤں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر دُور کے دشمن کو بغیر کسی تیاری کے کیوں نشانہ بنایا گیا) لیکن ان لوگوں کے لئے جو خود کو عالمی جہادی تحریک کی بڑھتی ہوئی صفوں میں سمجھتے ہیں، ''دُور کے دشمن'' کو میدان جنگ میں گھسیٹنے، علاقائی رنجشوں کو وسعت دینے کیلئے جہادازم کی حکمت عملی اور انہیں قوم پرستی کے معاملات سے آگے لے جانے اور اپنے مدار کو قریبی دشمن سے ''دُور کے دشمن'' تک پھیلانے سے نہ صرف یہ کہ دشمن کو پہچان کے حوالے سے امّہ کے ذہنی الجھاؤ کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ شامی دانشور الصوری کے مطابق جہادیوں کی جدوجہد متحارب سیاسی تصورات کے درمیان جنگ نہیں بلکہ عقیدے اور بے دینی کے درمیان کائناتی مقابلہ ہے۔ یا الظواہری کے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''اسلام اور کفر'' کے درمیان مقابلہ ہے۔ ایسی جنگ میں کوئی بھی شخص غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اسلام کی خاطر جہاد کے اعلان پر

لبیک کہے اور کائناتی جنگ میں شریک ہو جو اسرائیل میں ہوگی۔ اسرائیل اس جنگ میں قوم پرستی اور بین الاقوامی شناختوں کا مرکز ہے۔ جہاں سیکولر اور مذہبی قوم پرستی متصادم ہیں جس کے نتائج عمومی طور پر خون آشام ہوتے ہیں، جہاں کائناتی جنگ کا تصور پیدا ہوا اور جہاں، یہودی، عیسائی اور مسلم روایت کے مطابق آخری جنگ لڑی جائے گی اور جس کا اختتام ہولناک ہوگا۔

☆☆☆

باب دوم

ارض موعود کا وعدہ

یروشلم۔ خدا کا شہر۔ اس سے بہتر کائناتی ڈرامہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس شہر کے ساتھ اپنی نسبت جوڑنا کافی مشکل ہے۔ یہاں وقت تغیر پذیر رہتا ہے۔ ماضی اور حال۔ دو خود مختار رشتے۔ یروشلم میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گُتھے ہوئے ہیں جس کی تشریح ممکن نہیں یا جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ صرف ایک چیز اٹل یا مستقل ہے اور وہ ہے خلاء یا فضائے بسیط جسے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جو ابدی و ازلی ہے۔ مقامِ سکون یا سکون کے چبوترے اور چمکتے ہوئے شیشے کی دیواروں والے سیاحتی مرکز کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس کے باوجود یہ شہر ہی رہے گا جسے دو ہزار سال قبل ہیروڈ نے تعمیر کیا تھا۔

تاریخ نے ہیروڈ اعظم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ نومولود موسیٰ کی تلاش کے دوران بیت اللحم کے سینکڑوں بچوں کو قتل کرنے کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اس ناپسندیدہ اور مکروہ فعل کو میتھیو کی انجیل میں اس کے ساتھ جوڑا گیا ہے لیکن اس واقعے کی تصدیق کا کوئی ذریعہ تا حال دریافت نہیں ہوا اور نہ ہی اس دور کی تاریخ میں اس کا کوئی ذکر موجود ہے۔ عام طور پر ہیروڈ کو ایک سفاک اور اوباش نیم یہودی (اس کی ماں عرب تھی) قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک لالچی بدکار شخص تھا جو یہودی سے زیادہ رومن تھا۔ اسے ایک انتہائی طاقتور لٹیرا قرار دیا جاتا ہے جس نے انتہائی خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔

اس بدنامی کے باوجود یہ ہیروڈ ہی تھا جس نے یروشلم میں مارکیٹیں، تھیٹرز، محلات اور بندرگاہیں، اکھاڑے، تماشہ گاہیں، ناچ گھر اور حمام تعمیر کروائے جس کے سبب یروشلم قدیم دنیا کا

محبوبِ عالم شہر قرار پایا۔ طالمود کا کہنا ہے کہ ''اللہ نے دنیا کو حسن کے دس عجوبوں سے نوازا ہے اور ان میں سے نو عجوبے یروشلم کو عطا کئے ہیں''۔

ہیروڈ کی سب سے اہم کامیابی یروشلم کے معبد کا احیاء اور اس کی توسیع ہے جو اس نے کوہ موریہ کی چوٹی پر قائم کی۔ کوہ موریہ کی چوٹی شہر کی سب سے بلند جگہ ہے۔ اسے یروشلم کے سفید پتھروں کے بڑے بڑے رومی طرز تعمیر کے ستونوں پر کھڑا کیا گیا۔ یہ یروشلم کا دوسرا معبد تھا۔ پہلا معبد اسرائیل کے بادشاہ سلیمان (Soloman) نے تعمیر کیا تھا لیکن اسے ۵۸۶ قبل مسیح میں بابلیوں نے تباہ کر دیا تھا۔ دوسرا معبد اس کے تقریباً ستر سال بعد تعمیر ہوا لیکن اس کی تعمیر نو اور آرائش و زیبائش کے صرف پچاس برس بعد سن ۷۰ عیسوی میں رومیوں کی بڑی آنکھوں والے انقلابیوں کی جو پرجوش (Zealots) کہلاتے تھے، بغاوت کی سزا کے طور پر اس معبد کو تباہ و برباد کر دیا۔

ہیروڈ معبد کا آج اگر کچھ حصہ بچا ہے تو وہ ہے کوہ موریہ کی مغربی بنیاد پر کھڑی ہوئی دیوار، جسے ''دیوار گریہ'' کہا جاتا ہے اور بعض اوقات کوٹل بھی کہا جاتا ہے۔ اس دیوار کے بارے میں کوئی خاص بات تو نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ دیوہیکل دیوار ہے۔ یہ نا آراستہ بے زینت رہتی ہے۔ یہ دیوار جن پرانے پتھروں سے چنی گئی ہے اُن کے درمیان موجود دراڑوں میں سے گھاس اور جھاڑیاں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے معبد کی تباہی سے اب تک اس دیوار کو یروشلم میں خدا کی موجودگی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ یہودی یہاں آ کر عبادت کرتے ہیں، پتھروں کے ساتھ اپنی چھاتیاں رگڑتے اور انہیں چومتے ہیں اور وہ یہ سب کچھ مذہبی فریضہ سے زیادہ سمجھ کر کرتے ہیں۔ دراصل اپنے واویلے میں وہ سیاسی بیان بازی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ دیوار ہزاروں برسوں سے یہاں کھڑی ہے اور یہودی قوم کی پیدائش کی گواہی دیتی ہے اس لئے یہودی سمجھتے ہیں کہ یہودیوں کو واپس آ کر اس مقدس شہر میں مستقل طور پر آباد ہونا چاہیے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک یہ دیوہیکل دیوار زمین سے اکھاڑ لی نہیں جاتی یہودیوں کو یروشلم سے نکالا نہیں جا سکتا۔

جس روز میں نے معبد کو دیکھا، اسرائیلی فوج کے کیڈٹوں کا ایک بڑا گروپ عبادت کے لئے دیوار گریہ پر موجود تھا۔ یہ ایک قابل دید منظر تھا۔ ہشاش بشاش چہروں والے مختلف نسلوں اور دیسوں کے نوخیز لڑکے زیتونی سبز رنگ سے ملتی جلتی یونیفارم پہنے سیاہ چادروں میں لپٹے داڑھیوں

والے بوڑھے آدمیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر رقص کناں تھے۔ ان میں سے ہر ایک آگ کے جھلملاتے ہوئے شعلوں کی طرح آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے حرکت کر رہا تھا۔

کسی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ وہ ایک تقلید پسند لڑکی تھی جس کے چہرے پر زردی چھائی تھی، اس کی عمر بیس ایک برس ہوگی۔

''کیا تم یہودی ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ وہ سفید رنگ کی چادر سر پر لئے ہوئے تھی۔

''نہیں'' میں نے جواب دیا ''لیکن میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے''۔

وہ نامطمئن نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ وہ مینا پولس سے تعلق رکھتی تھی اور ایک طالبہ تھی اس نے سکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی تاکہ وہ رضا کار کے طور پر یروشلم میں یہودیوں کی موجودگی کی بنیاد کو وسیع کر سکے۔ جب ہم دیوار گریہ کے ساتھ کھڑے تھے تو وہ یہودیوں کے نزدیک اس دیوار کی ازلی و دائمی اہمیت کے بارے میں بات کرتی رہی۔ وہ بہت پُر جوش تھی۔ اس نے مجھے اس بارے میں کتابچے اور ایک ایک صفحے پر مشتمل اشتہار اور سوونیئر دیئے۔ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسکا رواں رواں حرکت میں تھا اور وہ اس جگہ پر اپنی موجودگی کے حوالے سے اپنے احساسات مجھ تک منتقل کر رہی تھی۔

''آیئے اس پہاڑی کی چوٹی تک جائیں جس پر یہ معبد تعمیر ہے''۔

وہ جھجک رہی تھی۔ راسخ العقیدہ یہودی معبد کی بحالی کیلئے روز دعا کرتے تھے۔ بنیاد پرست ربی (یہودیوں کے مذہبی رہنما) اوپر جانے سے ہچکچاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک حضرت مسیح دوبارہ نمودار نہیں ہوتے، یہودیوں کے لئے معبد والے پہاڑ کی چوٹی پر جانا ممنوع ہے۔ البتہ حادثاتی طور پر کوئی ایسا کرے تو اور بات ہے۔ معبد کے داخلی راستے پر اسرائیل کے اعلیٰ ترین ربی کی طرف سے ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے ''اس جگہ کے تقدس کے پیش نظر یہودیوں کے لئے ٹمپل ماؤنٹ (معبد کی چوٹی) پر جانا ممنوع ہے''۔ چند ایک کو چھوڑ کر عمومی طور پر یہودی اس تنبیہ کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

''آپ اوپر جائیں، میں یہاں آپ کا انتظار کروں گی''۔ اس نے کہا۔

اس نے کیمرے تھامے سیاحوں کی طرف اشارہ کیا جو ٹمپل ماؤنٹ کی طرف جانے والی لکڑی کی بنی ڈھلوان پر قطار میں کھڑے تھے۔ بھاری اسلحہ تھامے اسرائیلی فوجی اس راستے کی

حفاظت پر مامور تھے۔ مجھے قطار میں کھڑے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ان میں سے ایک فوجی نے میری طرف اشارہ کیا۔

''تم'' وہ بھوں بھوں کرتے ہوئے کہنے لگا ''تم اپنی کمر پر لدے بیگ کے ساتھ داخل نہیں ہوسکتے''۔

''ہر کسی کی پشت پر بیگ ہے''۔

''مسلمان تمہیں پشتی تھیلے کے ساتھ پہاڑی پر نہیں جانے دیں گے، اس معاملے میں تمہاری ایک نہیں چلے گی''۔

''لیکن میں مسلمان ہوں''۔

''لیکن اس معاملے میں تمہاری ایک نہیں چلے گی''۔

اگرچہ اسرائیلی سیکورٹی فورسز کی قانونی عمل داری پورے پرانے شہر پر ہے، لیکن ٹمپل ماؤنٹ یروشلم کے مسلمان حکام کے کنٹرول میں ہے جسے وقف کہا جاتا ہے۔ برسہابرس سے اس نازک سے توازن کو آزمائش میں ڈالا جاتا رہا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں لیکوڈ پارٹی کے سابق وزیراعظم ایریل شیرون نے یہ حرکت کی۔ وہ پارٹی قیادت سنبھالنے کی دوڑ میں موجود لیکوڈ لیڈر بنجامن نیتن یاہو کے مدمقابل تھا۔ وہ پارٹی کے ارکان کی پرجوش حمایت حاصل کرنے کیلئے اپنے حامیوں کے ہمراہ ٹمپل ماؤنٹ آیا۔ یادرہے کہ یہ وہی ایریل شیرون ہے جس نے ۱۹۸۲ء میں لبنان میں صابرہ اور شتیلہ کے مہاجر کیمپوں میں مقیم ہزاروں فلسطینیوں کو قتل کیا تھا۔ دیوار گریہ کے سامنے کھڑے ہوکر ایریل شیرون نے اعلان کیا کہ ''ٹمپل ماؤنٹ ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہمارے ہاتھوں میں ہی رہے گا۔ یہ یہودیت کا مقدس ترین مقام ہے اور ہر یہودی کا یہ حق ہے کہ وہ ٹمپل ماؤنٹ کے درشن کرے''۔

اس اعلان کے ساتھ ہی پرانے شہر میں افواہ پھیل گئی کہ یہودی ٹیمپل ماؤنٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ غضبناک فلسطینیوں کا ایک ہجوم اس طرف بھاگا اور یہودی پجاریوں پر پتھراؤ شروع کردیا۔ اسرائیلی پولیس نے آنسوگیس سے اس کا جواب دیا۔ تیس سے زائد فلسطینی اور اسرائیلی زخمی ہوئے۔ اس واقعہ نے دوسری فلسطینی بغاوت، جسے انتفادہ کہا جاتا ہے، کو جنم دیا، بہرحال اس واقعہ نے پارلیمانی انتخابات میں شیرون کی مدد کی اور اس نے نیتن یاہو کو شکست دیدی۔

میں اپنی پشت پر بندھے تھیلے کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں سیاحوں کی

قطار سے نکل آیا اور دیوار گریہ کے اردگرد ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ میں ڈولوروسا اور کرسچین کوارٹر کے راستے۔ پرانے شہر کے یہودی اور آرمینین کوارٹروں کے پاس سے گزر کر مسلمانوں کے گنجان آباد علاقے میں گیا۔ اس آبادی کے دروازوں سے گزر کر پتھروں سے بنے گنبد، چینی مٹی سے تعمیر کردہ معبد کی دیوار کے قریب پہنچا۔ دراصل یہ وہ جگہ ہے جہاں پر کبھی یروشلم کا معبد ہوتا تھا، تیرہ سو سال قبل تعمیر کیا گیا یہ معبد یعنی ''ڈوم آف راک'' مسجد نہیں تھا ٹمپل ماؤنٹ کی چوٹی پر جو مسجد ہے (جسے فلسطینی حرم الشریف کہتے ہیں) مسجد الاقصیٰ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ پہاڑ کے جنوب مشرقی کنارے پر ہے۔ ڈوم آف راک بنیادی طور پر مکہ کے متبادل حج کا مقام بنایا گیا تھا تاکہ عقیدت مند مسلمان زیادہ تعداد میں یروشلم آئیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس پہاڑی پر حضرت محمد ﷺ معراج کے وقت آسمانوں کی طرف جاتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے، تب سے یہ گنبد وہیں پر ہے بالکل دیوار گریہ کی طرح۔ یہ جگہ مذہبی طور پر جتنی متبرک ہے اتنی ہی اس کی سیاسی اہمیت بھی ہے۔ یہ دیوار مقدس شہر میں مسلمانوں کی مستقل موجودگی کی علامت بن چکی ہے۔ سونے کے چمکتے ہوئے گنبد یا قبہ کی شبیہیں آپ کو ہر فلسطینی کے گھر میں ملیں گی۔ فلسطینی صدر اور الفتح کے سربراہ کی میز کے پیچھے اس گنبد کی تصویر آپ کو آویزاں نظر آئے گی۔ تصویر دو تلواروں کے درمیان میں لگی ہوتی ہے اور حماس کی مہر پر بھی آپ اسے کندہ دیکھ سکتے ہیں۔

ٹمپل ماؤنٹ تک اس طرف سے رسائی ''وقف'' کے اختیار میں ہے۔ جو عیسائیوں یا یہودیوں کو بڑے گروہوں کی صورت میں اس جگہ اکٹھے ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی وجہ ان کا یہ خوف ہے کہ ان سے ان کی یہ جاگیر چھین کر انہیں اعزاز سے محروم نہ کر دیا جائے۔ یہ کوئی خلل دماغی یا مالیخولیا نہیں ہے۔ پہاڑی پر بنے گنبد کو گرا کر اس کے کھنڈرات پر ''تیسرے معبد'' (Third Temple) کی تعمیر، یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے انتہا پسند گروپوں کا مقصد حیات تھا اور ہے۔ ۱۹۶۹ء میں آسٹریلیا کا ایک عیسائی کسی نہ کسی طرح ٹمپل ماؤنٹ تک پہنچ گیا اور اس نے مسجد الاقصیٰ کی چاندی سے بنی چھت کو آگ لگا دی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں ایک اسرائیلی فوجی، فوج کی طرف سے دی گئی ایم۔۱۶ رائفل لے کر مسجد میں گھس گیا اور نمازیوں پر بلا امتیاز فائرنگ کر دی۔ ایک خودسر اور سرکش انتہا پسند یوئل لرنر پہاڑی پر بنے اس گنبد کو دھماکے سے اڑا دینے کے الزام میں تین بار پکڑا گیا۔ ہر دفعہ مقدمے کی سماعت کے دوران لرنر نے واضح طور پر کہا کہ

اسرائیل کی سیکولر حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہیے اور اس کی جگہ یہودی حکومت الٰہیہ قائم کی جانی چاہیے۔

اس گنبد کو تباہ کرنے کی سب سے بڑی کوشش ۱۹۸۴ء میں کی گئی۔ ایک فلسطینی محافظ نے علی الصبح اپنے گشت کے دوران دیکھا کہ پلیٹ فارم کو جانے والا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے فوری طور پر اسرائیلی سیکورٹی فورسز کو مطلع کیا جو فوراً اس جگہ پہنچ گئیں۔ اندر گھس آنے والے اس وقت تک بھاگ چکے تھے لیکن وہ جو کچھ وہاں چھوڑ گئے اس سے یہ اشارہ دے گئے کہ کچھ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس واقعہ نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ گنبد کے چاروں طرف سینکڑوں پاؤنڈ کا دھماکہ خیز مواد، فوج کی طرف سے جاری کئے گئے درجنوں گرینیڈ، ڈائنامائٹ کے بکس، رسّے، سیڑھیاں اور دھماکہ کرنے والے کھلونوں کی بوریاں بکھرے پڑے تھے۔

دو ماہ کی تحقیقات کے نتیجے میں تین افراد کو گرفتار کیا گیا جو یروشلم کے قریبی گاؤں لفتا وادی کے رہنے والے تھے۔ یہ وادی اپنے موسم بہار اور خوبصورت باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسرائیلی میڈیا نے اسے ''لفتا گینگ'' کا نام دیا۔ ان تینوں نے عدالت میں تسلیم کیا کہ ان کا تعلق ایک خفیہ یہودی تنظیم سے تھا جن میں سے کچھ ارکان نے گنبد کو تباہ کرنے اور ٹمپل ماؤنٹ کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد اس پر دوبارہ معبد بنانے کی سازش تیار کی اور یہ سب کچھ کرنے کا مقصد مسیحا کی آمد کیلئے راستہ ہموار کرنا تھا۔

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو یہاں خونریزی ہوتی اور یہی ان کا مقصد بھی تھا۔ لفتا گروپ آخری تصادم چاہتے تھے جو ہر یہودی، مسیحی اور مسلمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور ایک کائناتی جنگ شروع ہو جاتی۔ سماعت کے دوران جب ان سے کہا گیا کہ وہ اس قسم کی صورتحال میں موت کا شکار ہونے والے یہودیوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں تو یہ تینوں بے حس کھڑے رہے۔ ان پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ انقلابیوں کو قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسلم کوارٹر کی پچھلی گلیوں میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے میں پہاڑی پر بنے گنبد کی طرف جانے والے کمزور اور ڈھیلے سبز دروازوں پر پہنچ گیا۔ دہلیز پر فوجی وردی میں ملبوس دو نوخیز لڑکے مشین گنیں لئے بڑی ہوشیاری سے مجھ پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔

''ٹھہرو''۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے عربی میں کہا۔

''میں صرف عبادت کرنا چاہتا ہوں'' میں نے کہا۔

''کیا تم مسلمان ہو؟'' ایک نے کہا۔ ''مجھے سناؤ'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرے نے مجھ سے کہا۔ میں اندازہ نہ کرسکا کہ اس کی بات کا مطلب کیا تھا۔

''فاتحہ'' دوسرے نے اچانک کہا۔ ''ہمیں فاتحہ سناؤ''۔

میں نے قرآن پاک کے ابتدائی لفظ کہے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

''او کے، او کے'' پہلے محافظ نے پہلی بار انگریزی میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اب تم ہمیں پانچ ڈالر دو''۔

''پانچ ڈالر! مگر کس لئے؟''

''تمہارے تھیلے کی حفاظت کرنے کیلئے۔ یہودی تمہیں تھیلا اندر ساتھ نہیں لے جانے دیں گے''۔

سو۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور دہائیوں کیا صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اگر کوئی قوم ایک تاریخی حکایت ہے جسے ایک متحد قوم کے طور پر قصوں، داستانوں اور یادداشتوں میں بیان کیا گیا ہے اور ریاست جوان روایات کو آپس میں جوڑ کر رکھتی ہے، ایسی صورت میں کیا کرسکتی ہے جب دو متضاد قومی روایات یعنی اسرائیل اور فلسطین آمنے سامنے ہوں۔ ریاست ان میں سے کسی ایک کو بھی دائمی امن قائم کرنے کے اعلیٰ مقصد کی طرف راغب نہیں کرسکتی۔

اسرائیلی ریاست کی کہانی عام طور پر یوں شروع ہوتی ہے۔

پیرس ۱۸۹۴ء۔ فرانس کے دارالحکومت کے قلب میں جرمنی کے مضبوط سفارتخانے میں صفائی کرنے والی ایک خاتون عمارت کے اندر چکر لگا رہی تھی کہ اسے جرمنی کے فوجی اتاشی کی ردی کی ٹوکری میں ایک مشکوک کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ فوجی اتاشی کا نام میجر ماکس وون شوارٹز کوپین تھا۔ کاغذ کا یہ ٹکڑا فرانسیسی زبان میں ہاتھ سے لکھا ہوا سرکاری روزنامچہ (یادداشت) تھا جو شوارٹز کوپین کے نام تھا۔

اس میں لکھا گیا تھا ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بہرحال جناب! میں بہت سی دلچسپ باتیں آپ کو بھیج رہا ہوں''۔

اس میں فوجی خفیہ دستاویزات کی فہرست تھی جو جرمن میجر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس

فہرست میں فرانسیسی آرٹلری کی ترتیب (فارمیشن) اور ''۱۲۰۔ایم ایم توپ کی ہائیڈرالک بریک کے بارے میں لکھا ہوا نوٹ تھا''۔ ہائیڈرالک بریک فرانسیسی فوج کا نیا ہتھیار تھا۔

اس دستاویز پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔اس میں صرف یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ میجر جب بھی کہے گا اسے خفیہ فائل مہیا کر دی جائے گی۔تاہم صفحے کے آخر پر مختصر طور پر لکھا گیا تھا ''میں جوڑ توڑ کیلئے جا رہا ہوں''۔

صفائی کرنے والی خاتون فوری طور پر سمجھ گئی کہ اس کے ہاتھ کیا لگا ہے۔''میں جوڑ توڑ کیلئے جا رہا ہوں''۔اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ فوج میں کوئی ہے جو جرمنوں کو فوجی راز مہیا کر رہا ہے۔یہ غداری تھی۔اس نے یہ تحریر فرانسیسی خفیہ ایجنسی کے حوالے کر دی جس نے وقت ضائع کئے بغیر ایک کم درجے کے جنرل سٹاف آفیسر اور السیس کے ایک یہودی الفریڈ ڈریفس پر بغاوت کا الزام لگا دیا۔

اس الزام کی کوئی شہادت نہیں تھی سوائے اس کے کہ ڈریفس کی تحریر اس میمو کی تحریر سے ملتی تھی۔کسی شہادت کی ضرورت نہیں تھی۔ڈریفس کے خلاف الزام کو جب پہلی بار عوام کے سامنے پیش کیا گیا تو فرانسیسی انٹیلی جنس کے سربراہ نے یہ جان کر کہ ڈریفس یہودی تھا، فوج اور فرانس میں پھیلے ہوئے لسانی تعصب کا احاطہ یہ کہہ کر کیا کہ ''مجھے اس کا ادراک ہونا چاہیے تھا''۔

مقدمہ چلا مگر یہ ایک سوانگ یا تماشہ تھا۔ڈریفس کے خلاف زیادہ تر جعلی مواد تیار کیا گیا تھا اور یہ بات واضح طور پر سامنے بھی آ رہی تھی۔یہ مواد کرنل ہوبرٹ ہنری نے تیار کیا تھا۔ڈریفس کے خلاف دوسری بڑی شہادت یہ تھی کہ وہ فرانسیسی نہیں تھا اور یہودی تھا۔

شاہ پسندوں اور قوم پرستوں پر مشتمل عدالت نے بند کمرے میں بیٹھ کر خفیہ اجلاس کر کے ڈریفس کو سزا دے دی۔اسے اپنے خلاف شہادتی مواد دیکھنے کی اجازت تک نہ دی گئی۔اس کے مسلسل احتجاج کے باوجود ڈریفس کو تاعمر قید تنہائی کی سزا دے کر جزیرۂ ڈیول (Devil) بھیج دیا گیا۔یہ بدنام زمانہ جیل فرانسیسی گیانا کے ساحل سے پرے واقع ہے۔

انیسویں صدی کے یورپ میں ایک ساتھ سامی مخالف لہر کے عروج اور قوم پرستی کی اٹھان محض کوئی حادثہ نہیں تھا۔آپ جانتے ہیں کہ قوم پرستی کسی قومی ریاست کے اندر نسلی یا ثقافتی ہم آہنگی کا ابتدائیہ ہوتی ہے۔یہ وہ واحد مشترکہ شناخت ہے جو رعایا یا آبادی کے لوگوں کو آپس

میں جوڑتی ہے۔لیکن یورپ کے ہر کونے میں صدیوں سے رہائش پذیر ہونے یا مستقل طور پر رہنے کے باوجود یہودی ایک اجنبی یا پردیسی ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے یہودیوں کے ذہنوں میں یہ بات ہو کہ اگر وہ یورپی معاشرے میں گھل مل گئے تو کہیں ان کی شناخت ہی ختم نہ ہو جائے۔الفریڈ ڈرائفس کے مقدمہ کی خفیہ سماعت اور اس کو دی جانے والی غلط سزا ایک انسانی المیہ تھا۔لیکن اس معاملے نے فرانسیسیوں میں قومی شناخت کے گمبھیر مسائل پیدا کر دیئے۔دائیں بازو کے اخبار کے ایڈیٹر ایڈورڈ ڈرومونٹ نے بہت سے فرانسیسی قوم پرستوں کے جذبات کی یہ کہہ کر ترجمانی کی کہ ڈرئفس کی غداری اس کی نسل کی بہیمانہ منزل مقصود ہے۔ یہودی قوم کے اندر ایک قوم ہیں اس لئے سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ فرانس کے وفادار ہوں گے۔

ڈرومونٹ نے اپنے ممتاز جریدے ''لالبر پیرول'' میں مطالبہ کیا کہ ''یہودیو! یورپ سے نکل جاؤ۔فرانس فرانسیسیوں کے لئے ہے''۔

ڈرومونٹ ایک بھڑک اٹھنے والا، لحیم شحیم اور غضبناک قسم کا شخص تھا جس کی سخت داڑھی اس کی چھاتی پر پھیلی ہوئی تھی۔اس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ یورپ میں سامی نسل کے خلاف جدید تحریک کا سرغنہ تھا۔اس کی کتاب ''یہودی فرانس'' کے دس لاکھ نسخے فروخت ہوئے اور فرانسیسی زبان میں اس کے ایک سو سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کے علاوہ یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی اس کے تراجم شائع ہوئے۔ یہ کتاب فرانس میں یہودیوں کی موجودگی کے بارے میں پریشان کر دینے والے حقائق پر مبنی ہے۔''یورپ میں یہودی کا مسئلہ'' کے بارے میں ڈرومونٹ نے متعصّبانہ دلیل اس وقت دی جب ابھی یورپ میں نیشنلزم کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔قوم پرستی کے حوالے سے تاریخ دان ایرک ہوبس بان لکھتا ہے کہ ''اپنے مطلب کے حوالے سے نیشنلزم کی تعریف ان لوگوں کا احاطہ نہیں کرتی جو اپنی ''قوم'' سے تعلق نہیں رکھتے۔اس کا مطلب نسل انسانی کی بھاری اکثریت ہے۔

مشترکہ شناخت بنانے کا کام بہت دشوار ہوتا ہے خاص طور پر وہ مشترکہ شناخت جس کی بنیاد شناختی مشابہت کی طرح مبہم اور دھندلی ہو۔ایسی صورت میں خود کی پہچان کروانا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔یورپ کے زیادہ تر حصے میں یہودیوں نے قوم پرست تحریکوں کی مخالفت ہی کی ہے۔ یہ

بات مائیکل ونوک نے فرانس میں سامیت مخالف سے متعلق اپنی تاریخ میں بیان کی ہے۔ ونوک کا کہنا ہے کہ یہودیوں کے باعث یورپ کی قومی شناخت سامنے آئی۔ خارجی گروپ نے داخلی گروپ کو شکل دی۔ ایسے وقت میں فرانسیسی یا جرمن یا ڈچ ہونے کا کیا مطلب تھا جبکہ اس وقت یہ شناختیں محض تصور کے طور پر تھیں اور قومیتوں کے خط و خال ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔ اس کا مطلب یہودی ہونا نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ فرانس کے تمام لوگوں نے ڈرومونٹ کی تقلید نہیں کی۔ افسروں، سیاستدانوں، ججوں، وکیلوں، دانشوروں کی ایک بڑی تعداد ڈریفس کی حمایت میں نکل آئی۔ ان میں ایک ہم نام ادیب ایمل زولا کا ہے جس کا لکھا ہوا مشہور و معروف اعلامیہ ''جے ایکیوز'' پریس کے ممتاز روزنامہ ''لا اورور'' کے پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا۔ اس اعلامیہ کا پورے فرانس میں بڑا چرچا ہوا۔ اعلامیہ ڈریفس کی حمایت میں تھا جس میں اسے بے قصور اور معصوم قرار دیا گیا تھا۔ اس مہم کو کامیابی حاصل ہوئی اور آخر کار ڈریفس کو رہا کر دیا گیا۔ بہر حال اس دوران وہ پانچ سال کا عرصہ بدنام زمانہ جیل ''ڈیولز آئی لینڈ'' میں گزار چکا تھا۔ ارنسٹ رینان لکھتا ہے ''نیشنلزم کے لئے اتحاد اور زیادہ اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم ظلم و تشدد کے ذریعے نیشنلزم کی شکل بگاڑ دی جاتی ہے''۔ ڈریفس کے معاملے نے یورپی نیشنلزم کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جس کے نتیجے میں نازی ازم کا عروج ہوا اور جس کے سبب ساٹھ لاکھ یہودیوں کا قتل ہوا۔

اس گھناؤنے اور مکروہ واقعہ سے تقریباً نصف صدی قبل ممتاز یہودی دانشوروں کی ایک بڑی تعداد کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ یورپی ثقافت میں گھل مل جانے کی کوشش سعیٔ رائیگاں کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ یورپ کی تیزی کے ساتھ ابھرتی ہوئی قومی ریاستوں میں ثقافتی یک رنگی یا یکسانیت کا حصہ بننا محض ایک تصور ہی ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ٹھوس حقیقت نہیں بن سکتا اور یہودی اس کا حصہ نہیں بن سکتے اور زمین کے اس خطے پر ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ڈرومونٹ صحیح کہتا تھا۔ یہودی ایک قوم کے اندر ایک قوم تھے۔ وہ خود کو یورپ سے آزاد کر کے اور اپنی ایک علیحدہ قومی ریاست کے قیام کے ذریعے ہی ایذا رسانی اور ظلم و تشدد سے بچ سکتے ہیں۔

یہ ایک دلکش خیال تھا اس لئے کہ مختلف ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے لئے یہودی ثقافتی

وحدت کا تصور ہی بے حد مشکل تھا۔ زمین پر قومی وحدت پیدا کرنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اور اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زمین کے کس حصے پر؟ ہوسکتا ہے کہ یہودی قومی ریاست کا تصور محض تصور ہی رہتا اگر کچھ نادر تاریخی واقعات نہ ہو جاتے۔ جس روز ڈریفس کو سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اس کی بے عزتی کرتے ہوئے ڈیولز آئی لینڈ جیل لے جایا جا رہا تھا تو لوگ بیک آواز گا رہے تھے ''موت بر یہودی''، ''غدار کے لئے موت''۔ اس نعرے لگاتے مجمع میں وینس کا ایک نوجوان اخبار نویس اور نیا نیا ڈرامہ نویس بھی موجود تھا جو اس واقعہ کی رپورٹنگ کے لئے پیرس آیا تھا۔ اس کا نام تھیوڈور ہرزل تھا۔

اسرائیلی ریاست کا تصور درحقیقت ڈریفس والے اس واقعہ سے بارہ برس قبل جرمنی میں چھپنے والے ایک پمفلٹ کے ذریعے سامنے آیا تھا جسے پولینڈ کے ایک ڈاکٹر لیون پنسکر نے ''آٹو امینسی پیشن (Auto Emancipation) کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس پمفلٹ کے ذریعے صیہونیت کے بڑھاوے کی مہم کا آغاز کیا گیا تھا۔ یہ مہم یہودی آبادکاروں نے شروع کی تھی جس کا مقصد قومی فلسفے کو ابھارنا اور اسے متشکل کرنا تھا۔ بعد میں یہ تحریک صیہونیت کے نام سے پہچانی جانے لگی۔

پنسکر کے مطابق یہودیوں کا ''پرانا اور سب سے اہم مسئلہ'' یہ حقیقت ہے کہ وہ نہ تو کسی قوم کا خود کو حصہ بناتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور قوم انہیں اپنے آپ میں تحلیل کرتی ہے''۔ پنسکر کی کہی ہوئی یہ بات دو بنیادی سچائیوں کا خلاصہ ہے۔ پہلی یہ کہ یہودی دنیا بھر کے مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور دوسری یہ کہ وہ جن جن ملکوں میں رہتے ہیں وہاں وہ خود کو ستائی ہوئی اقلیت قرار دیتے ہیں۔ (پنسکر اس کو جیوڈوفوبیا قرار دیتا ہے۔ ''سامیت مخالف'' لفظ کی وجہ سے نسل پرستی کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں)۔ پنسکر کے مطابق اس دوہرے مسئلے کا حل یہ ہے کہ یورپ میں ابھرتی ہوئے نیشنلزم کے مقابلے میں یہودی نیشنلزم کو واضح شکل دی جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ پنسکر اچھی طرح سمجھتا تھا کہ دنیا بھر کے یہودی کسی مشترکہ لسانی، ثقافتی یا نسلی اکائی نہیں ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جو نیشنلزم کی بنیاد ہوتی ہیں۔ پنسکر اسے ''خلا میں اتصال'' قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہی نکتہ موجب یا وسیلہ بن سکتا ہے۔ جب تک یہودی پوری دنیا میں بکھرے رہیں گے، اس وقت تک ان کی قومی شناخت نہیں ابھر سکتی۔ پنسکر نے مزید لکھا کہ ''یہودی عوام کا اپنا کوئی وطن یا

جنم بھومی نہیں ہے جبکہ ان کے بہت سے مادر وطن ہیں۔ ان کا کوئی مرکز نہیں، کوئی حکومت نہیں اور نہ ہی سرکاری سطح پر ان کی کوئی نمائندگی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں اسے اپنا مسکن بنا لیتے ہیں لیکن ان کا اپنا گھر کہیں بھی نہیں ہے''۔

اس کا واحد حل یہ تھا کہ یہودی جن ملکوں میں رہتے ہیں، انہیں چھوڑ دیں اور ایک ایسے وطن میں قوم کی حیثیت سے رہنا شروع کر دیں جس کی سرحدیں ہوں۔ تاہم پنسکر کو اس تجویز میں بھی ایک مسئلہ نظر آتا تھا اور وہ یہ کہ ''کون سا ملک اپنی سرحدوں کے اندر ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دے گا''۔

چودہ سال بعد تھیوڈور ہرزل نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کے پاس اس مسئلہ کا حل تھا۔ جس وقت ''آٹو ایمنسی پیشن'' شائع ہوئی، اس وقت ہرزل ویانا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس زمانے میں ویانا میں نوجوان قوم پرست یہودی دانشوروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہرزل کے ایک ہم جماعت ناتھن برن باؤم نے یہودی قوم پرستوں کی ایک تنظیم ''قدما'' (مستعد) قائم کر رکھی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد یورپ کے یہودیوں میں قومی یکجہتی کا احساس پیدا کرنا تھا۔ یہ برن باؤم ہی تھا جس نے ۱۸۹۰ء میں لفظ ''صیہونیت'' ایجاد کیا لیکن ۱۸۹۶ء میں ہرزل نے ''یہودی ریاست'' کے عنوان سے ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں ایک الگ یہودی ریاست کے قیام کا مربوط تصور پیش کیا گیا تھا۔

برن باؤم کے برعکس ہرزل اپنے ملک کے سماج میں گندھا ہوا سیکولر یہودی تھا۔ وہ نہ تو عبرانی زبان جانتا تھا اور نہ ہی وہ وسطی و مشرقی یورپ میں بسنے والے یہودیوں کی زبان ''یدیش'' جانتا تھا اس کے علاوہ ہرزل کو یہودی ثقافت اور مذہب سے بھی کوئی زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن ڈریفس کے واقعہ نے اسے پوری طرح تبدیل کر دیا تھا۔ ایک معصوم انسان کے خون سے ہاتھ رنگنے کی کوشش کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ یورپ میں یہودیوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ انہیں خود اپنی ریاست قائم کرنی ہو گی۔ بعد میں آنے والے برسوں میں وہ مستقبل کی یہودی ریاست کے قیام کی جگہ کے بارے میں تعین کرنے پر رضا مند ہوا۔ یہ صرف ہرزل، برن باؤم اور صیہونی کانگریس کے لئے نہیں بلکہ ان کی قوم پرستی کی خواہش کو پورا کرنے کیلئے وادی فلسطین کے ساحلی میدانوں پر ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انجیل میں یروشلم کا نام

''زیون'' تھا۔ ہرزل نے ''یہودی ریاست'' میں لکھا کہ ''تاریخی طور پر ہماری ارض وطن کا نام فلسطین ہے''۔

مسئلہ یہ تھا کہ عربوں کی بڑی آبادی صدیوں سے فلسطین میں رہتی چلی آ رہی تھی۔ فلسطینی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بھی عربوں کے ساتھ ساتھ یہیں آباد تھی۔ تاہم آبادی کی بہت بڑی اکثریت عربوں کی تھی جن میں یہودی، مسلمان اور عیسائی شامل تھے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ خطہ زمین پہلے سے ہی آباد تھا اور خلافت عثمانیہ کے تسلط میں تھا جو اسے یورپ کے یہودیوں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بلکہ فلسطین اور خصوصاً یروشلم عربوں کے لئے بھی اتنا ہی متبرک تھا جتنا کہ یہودیوں کیلئے۔ جب ویانا کے ربیوں نے ایک مشن بھیجا جو یہ بتا سکے کہ ہرزل کے تصور کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس مشن نے ویانا ایک تار بھیجا جس میں لکھا کہ ''دلہن بہت خوبصورت ہے لیکن وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے''۔

ہرزل کے نزدیک مسئلہ کا حل اظہر من الشمس تھا تاہم اس میں کچھ مسائل تھے۔ ''ہمیں شریفانہ طریقے سے نجی ملکیتی زمین سرکاری طور پر خرید لینی چاہیے''۔ اس نے جون ۱۸۹۵ء میں اپنی ڈائری میں لکھا ''اور سرحد کے پار کی مالی طور پر کمزور آبادی کو خوش کر دینا چاہیے''۔ جیسا کہ اسرائیلی مورخ بنی مورس نے لکھا ہے کہ صدی کے اختتام تک فلسطینی عربوں کی بھاری اکثریت غربت کا شکار تھی اور غالباً ہرزل یہ کہنا چاہتا تھا کہ زیادہ تر آبادی کو کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔

ہرزل کا یہی مطلب تھا۔ اعداد و شمار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صیہونیت کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام تھا۔ اور اس ریاست میں یہودیوں کی اکثریت تبھی ممکن ہو سکتی تھی جب غیر یہودی آبادیوں کو یہاں سے ختم کر دیا جائے۔ یہودی ریاست کے اصلی معمار ڈیوڈ بن گوریان کی کم لفظوں میں دی گئی دلیل زیادہ مضبوط تھی۔ بن گوریان نے ۱۹۳۷ء میں اپنے بیٹے کو لکھا کہ ''عربوں کو جانا ہی پڑے گا''۔ لگتا ہے کہ صیہونیوں نے یورپی قوم پرستی سے یہ مثبت سبق سیکھا تھا کہ اتحاد کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ظلم و تشدد ہے۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے یہودی قوم پرستوں کو ایک تکلیف دہ معاملے کا سامنا کرنا پڑا جو یہ تھا کہ فرانس، جرمنی، عراق، روس، پولینڈ اور رومانیہ کے لوگوں کو جنہیں ایک دوسرے سے

الگ کر دیا گیا تھا، کیسے قومی شناخت کی وحدت میں لایا جائے۔ اس پیچیدہ سوال نے آخر کار برن باؤم اور ہرزل کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ برن باؤم کے نزدیک یہودی قومی شناخت کو صرف ثقافتی یک رنگی کی بنیاد پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یدش جیسی ایک مشترکہ زبان بھی ہو سکتا ہے۔ ہرزل جو یدش زبان نہیں بول سکتا تھا، تاریخی ورثے اور سرحدی یکجہتی کے غیر متعینہ نظریے یا تصور کو اس کی بنیاد سمجھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ لوگوں کو یکجا کیا جائے، ان کے اردگرد سرحدیں قائم کی جائیں اور یوں ایک قومی ریاست وجود میں آ جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہودی نہ ہوتے ہوئے بھی عقیدے، اس پر عمل اور یہودیت کے مذہبی اداروں کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ اشد حام جیسے ابتدائی یہودی لوگوں کا خیال یہی تھا۔ حام نے پنسکر کی ہوویوی زبون تحریک کی حمایت سے کام شروع کیا لیکن بعد میں اس نے یہودی یک رنگی کی مذہبی تعریف یا پہچان کو وسعت دی۔ ہرزل نے سیکولر یہودیت کے جس نکتہ نظر کو بیان کیا تھا، حام نے اس پر شدید تنقیدی رویہ اختیار کیا۔ ہرزل کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ہرزل نے پہلے یہودی مذہب کو ''توہماتی اور متعصّبانہ قرار دیا تھا۔ دریں اثناء راسخ العقیدہ یہودی، جن کے لئے یروشلم مقام زیارت تھا، اس وقت شدید صدمے سے دوچار ہوئے جب انہیں معلوم ہوا کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لئے مخصوص شہر کو سیاسی فرمانروائی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ جہاں تک ان راسخ العقیدہ یہودیوں کا معاملہ تھا تو ان کے لئے اس مسئلہ پر توریت کا قانون بڑا واضح تھا جس کے مطابق صرف مسیح" ہی اسرائیل کی ریاست دوبارہ قائم کر سکتے ہیں اور وہ بھی کائنات کے اختتام پر۔ اس کے علاوہ کٹر مذہب پرست یہودی بھی تھے جو راسخ العقیدہ یہودیوں کے متضاد، یہودی ریاست کے قیام کے حامی تھے لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ اس کو مذہبی ریاست بنایا جائے اور اس کی بنیاد یہودی قانون پر ہو۔ یہ نام نہاد مذہبی صیہونی پہلی عالمی صیہونی کانگریس میں شریک نہ ہوئے جو ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں منعقد ہوئی۔ بعد میں انہوں نے اپنی اپنی مذہبی جماعتیں بنالیں۔ یہی وہ مذہبی جماعتیں ہیں جو آج بھی سیکولر نیشنلزم کی مخالفت کرتی ہیں جس کی بنیاد پر اسرائیل قائم کیا گیا تھا۔

قتل عام کی ہولناکیوں کے بعد بھی یورپ میں خود کو شامل کرنے کی صیہونی دلیل کو تسلیم کرنا ناممکن تھا کیونکہ یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ یہودی

قوم خود کو کسی ریاست کا حصہ بنالے۔ سوال یہ اٹھا کہ کیا مختلف النسل، مختلف ثقافتی اکائی کی حامل، مختلف مذہبی عقیدہ رکھنے اور مختلف لسانی شناخت والی قوم ایک علیحدہ، سیکولر قوم پرست چھتری کے نیچے اکٹھی ہوسکتی ہے؟

فلسطین میں یہودی نیشنلزم کی بقاء کے لئے ''منفی محور ارضی'' ضروری تھا۔ یہ بات مائیکل ونوک نے کہی۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو خود کو ثقافتی یک رنگی، نسلی یکجہتی اور قومی اتحاد میں پروئے ہوئے سمجھتے تھے۔ متعدد یہودی پہلے ہی فلسطین میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق تھا تو انہوں نے فوری طور پر سرزمین فلسطین کے فطری باسی ہونے کی شکل اختیار کر لی۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں فلسطین میں یہودی قوم پرست ہونے کا کیا مطلب تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ وہ خود کو عرب نہیں سمجھتے تھے۔

ثقافتی یک رنگی کی بنیاد پر قومی شناخت قائم کرنے کیلئے ''قوم کے اندر قوم'' کو خارج کرنا ضروری تھا چنانچہ صیہونیوں نے فلسطین کے اندر اپنے لئے طبعی گنجائش پیدا کی یعنی یہودی ریاست کے حدیں قائم کرلیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس علاقے سے ان لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا جو یہودی ثقافت، مذہب، نسل یا لسانی ورثے کا حصہ نہیں تھے۔ اس طرح انہوں نے ان لوگوں کیلئے قومی شناخت وضع کر لی، جس کا تصور انہوں نے دو ہزار برسوں میں بھی نہیں کیا تھا۔ بن گوریان نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ''وادی سے عربوں کے انخلاء کے ساتھ ہی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم نے ایک حقیقی یہودی ریاست حاصل کر لی۔ اس حوالے سے ہمیں اب تک جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہ جادوئی چھڑی سے ختم ہو جائیں گی''۔

صیہونی رہنماؤں نے بڑی توجہ کے ساتھ تیار کی گئی ایک حکایت کا پرچار شروع کر دیا۔ اس حکایت کے مطابق فلسطین میں پہلے سے کثیر تعداد میں عربوں کی آبادی رہ رہی تھی لیکن وہ فلسطینی نہیں تھے۔ کوئی مختلف لوگ، قبیلہ اور قوم نہیں تھے۔ انہیں قومی وجود کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ عالمی سطح کی ''عرب قوم'' کا حصہ تھے اس لئے اس زمین پر، جس پر وہ رہتے تھے، ان کا کوئی دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اسرائیل کی آہنی خاتون ''گولڈا میئر نے وضاحت کے ساتھ کہا تھا کہ ''ایسا نہیں تھا کہ فلسطین میں رہنے والے فلسطینی لوگ خود کو فلسطینی کہتے تھے اور ہم آئے اور انہیں یہاں سے نکال کر ان سے ان کا ملک چھین لیا ہو۔ ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا''۔

چنانچہ صیہونیوں نے یہ نعرہ بلند کیا ''لوگوں کے بغیر ان لوگوں کے لئے خطہ زمین جن کے پاس خطہ زمین نہیں تھا''۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ صیہونیوں کے یہاں آ کر آباد ہونے سے پہلے تک فلسطینی یہودیوں کے مقابلے میں فلسطین کے عربوں میں کوئی پختہ قومی شعور نہیں تھا۔ اس وقت تک نیشنلزم خصوصی طور پر یورپی اور سیکولر نکتہ نظر تھا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقہ کے عرب دانشور اور بااثر زمیندار خود کو فلسطینی سمجھتے تھے یعنی وہ لوگ جو اس خطہ ارضی پر بستے تھے جس کا نام فلسطین تھا اور یہ خطہ اس علاقے سے دور تھا جو شام کہلاتا تھا۔ شام اس سلطنت میں تھا جو ترکوں کے زیر تسلط تھا۔ اس وقت تک فلسطین میں آباد عرب مسلمانوں کی اکثریتی آبادی خود کو خلافتِ عثمانہ کی رعیت سمجھتی تھی۔ (اس کے برعکس فلسطین میں آباد عیسائیوں میں فلسطینی باشندے ہونے کا ادراک کہیں زیادہ تھا اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صیہونیت کے خلاف مضبوط دلائل بھی عیسائی عربوں کی طرف سے ہی سامنے آئے)۔

اس دوران عرب قومیت کی لہریں ان سینکڑوں خفیہ ادبی سوسائٹیوں میں سرایت کرنے لگی تھیں جو بڑی تعداد میں پوری سلطنت عثمانیہ میں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ صورتحال اس زمانے کی ہے جب ہرزل اور برن باؤم ویانا میں ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ان سوسائٹیوں کے ارکان نے خصوصاً عرب شناخت (اور واضح طور پر سیکولر) کے خط وخال تیار کئے کہ اس عرب شناخت کا مقصد ترک ثقافتی برتری کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ مطالبہ کیا گیا کہ عرب اکثریت والے علاقوں کی سرکاری زبان عربی قرار دی جائے۔ (قومی اتحاد اور یگانگت میں زبان اہم کردار ادا کرتی ہے) ان عرب قوم پرستوں کو بڑھاوا ۱۹۰۸ء میں ہونے والے ینگ ترک انقلاب نے دیا۔ یہ انقلاب سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ عبدالحمید دوم کے خلاف فوجی طلبہ، نوجوان فوجی افسروں اور ترکی کے قوم پرستوں کی متحدہ قوت کی بغاوت کے نتیجے میں آیا تھا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں پوری سلطنت میں آئینی اصلاحات کا سلسلہ شروع ہو گیا یہ اصلاحات عام لوگوں کے نزدیک زیادہ اہم نہیں تھیں بلکہ انقلاب کو ''یورپ کے مرد بیمار'' کا خاتمہ سمجھا گیا۔ یاد رہے کہ یورپ کے لوگ سلطنت عثمانیہ کو ''یورپ کا مرد بیمار'' کہتے تھے۔ لیکن اس واقعہ نے عربوں کو قائل کر لیا کہ سلطنت عثمانیہ کے تسلط سے آزاد ہونا ممکن تھا۔

اس جذبے اور ادراک کو پہلی جنگ عظیم کے دوران اس وقت تقویت ملی جب برطانیہ نے

سلطنت عثمانیہ کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دینے والی بہت سی عرب ریاستوں کو مکمل آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ تاہم یہ وعدہ کبھی ایفا نہ ہوا لیکن سلطنت عثمانیہ جنگ کے مال غنیمت کے طور پر یورپی طاقتوں میں تقسیم کر دی گئی۔ جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو تب بھی یورپی ملکوں نے عرب ممالک کی ضمانت دی لیکن اس مرتبہ اوڈلف ہٹلر کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کرنے کیلئے یہ وعدہ کیا گیا۔ یہ وعدہ بھی توڑا گیا۔ لیکن ان وعدہ خلافیوں اور ۱۹۲۳ء میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے نے عرب دنیا میں قومی شعور کو بہت زیادہ بڑھاوا دیا۔ اگرچہ مصر اور شام اور ان جیسے دوسرے عرب ملکوں میں عرب قومیت کی کوئی واضح شکل نہیں ملتی تھی اور اس کی بنیاد بھی محض مشترکہ ثقافت اور ایک زبان پر تھی، لیکن اس کے مقابلے میں فلسطین میں پانچ لاکھ نئے یہودی مہاجرین کی موجودگی کی وجہ سے قومی تشخص کی تعمیر کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھی۔

صیہونیت کا غیر ارادی نتیجہ یہ تھا کہ اس سے فلسطینی عربوں میں پیدا ہونے والے ادراک کا رخ عربوں کے تصور قوم پرستی کے عمل سے موڑ دیا گیا اور اب اس کا رخ بڑی خوبصورتی کے ساتھ تراشی گئی فلسطینی شناخت کی طرف ہو گیا۔ صیہونیت نے فلسطینیوں کو اپنی مخصوص قومی حکایت سے متعارف کروایا۔ اس نے ایسے قومی اتصال کا مضبوط اور مستحکم شعور دیا جو عرب دنیا کے دوسرے حصوں میں کہیں نہیں تھا۔ اس نے یہودیوں اور برطانیہ دونوں کے قبضہ اور تسلط کے خلاف مزاحمت کی بنیاد پر مشترکہ شناخت مہیا کی۔ مختصراً یہ کہ فلسطین میں رہنے والے عربوں کے لئے صیہونیت ''منفی پول'' کی طرح ضرورت بن گئی۔ فلسطینی ہونے کا کیا مطلب تھا؟ اس کا مطلب یہودی نہ ہونا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے پوری طرح دستاویزی شکل دے دی گئی۔ اس پر اس قدر بحث مباحثہ ہوا کہ یہ پھر تاریخ کا حصہ بننے کی بجائے ایک داستان بن کر رہ گئی۔ ۱۹۱۷ء میں جب برطانوی فوجیں یروشلم میں گھس آئیں تو انہوں نے خود کو نیشنلزم کی مختلف تاویلیں کرنے والے گروہوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی میں پھنسا ہوا پایا۔ شروع شروع میں تو برطانوی، یہودی ریاست کے تصور کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ صیہونی دلیل کہ یہودیوں کے ہاتھوں میں فلسطین، بربریت کے خلاف ثقافت کی بیرونی چوکی کا کردار ادا کرے گا، غلط ثابت ہوا۔ جیسا کہ ہرزل نے کہا تھا کہ یہ ایک ایسا آلہ ہوگا جو علاقے میں برطانوی نوآبادیاتی مفادات کو فروغ دے گا جس کا

توڑ ممکن نہیں ہوگا، جس کی مزاحمت ممکن نہیں ہوگی۔ برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بالفور، جن کے نام سے بالفور ڈیکلریشن جیسی دستاویز موسوم ہے، اس میں اسرائیلی ریاست کے لئے برطانوی حمایت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس دستاویز میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ ''چاروں عالمی طاقتوں نے صیہونیت کی حمایت کی یقین دہانی کرائی ہے اور صیہونیت کی، چاہے وہ صحیح ہو یا غلط، اچھی ہو یا بری، جڑیں طویل روایات سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کا رشتہ موجودہ زمانے کی ضرورتوں، مستقبل کی امیدوں سے ہے۔ یہ کوئی درآمد شدہ شے نہیں بلکہ یہ عربوں کی خواہشات اور ان کے تعصّبات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، وہ عرب جو اس قدیم سرزمین پر اب بستے ہیں''۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر تیزی کے ساتھ پھیلتے ہوئے فسادات میں مصروف اور بری طرح منقسم آبادی کو برطانیہ اپنے تسلط میں رکھنے یا اندرونی صورتحال پر قابو پانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ فلسطین کا مسئلہ نئی قائم کردہ اقوام متحدہ کی اسمبلی کے حوالے کر دیا گیا جس نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر ۱۸۱ منظور کی جس میں دو علیحدہ اور مختلف ریاستیں قائم کرنے کیلئے کہا گیا اور یہ بھی طے کر لیا گیا کہ ہر ریاست نسلی اور مذہبی یک رنگی کی بنیاد پر استوار ہوگی۔

فلسطینیوں نے قرارداد نمبر ۱۸۱ کو یکسر مسترد کر دیا۔ فلسطینی مطالبات کی نمائندگی کرنے والی عرب ہائر کمیٹی (Arab Higher Committee) کا نکتہ نظر یہ تھا کہ ''علاقے کی یہ جغرافیائی تقسیم نامعقول، ناقابل عمل اور غیر منصفانہ ہے''۔ قرارداد کے تحت جو سرحدیں قائم کی گئی تھیں، وہ پر پیچ اور سانپ جیسی تھیں۔ عرب ہائر کمیٹی کا کہنا تھا کہ قرارداد کے ذریعے یہودیوں کو وہ جو اس وقت تک صرف سات فیصد زمین کے مالک تھے اور جو کل آبادی کا ایک تہائی سے بھی کم تھے، وہ حصہ دے دیا گیا جو ملک کا ۵۶ فیصد علاقہ بنتا ہے اور جس کے ۷/۸ حصے میں نارنگیوں کے باغ، زیادہ تر قابل کاشت اراضی اور بیجرہ روم کی اکثریتی بندرگاہیں موجود ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جب قرارداد منظور کی گئی تو اس وقت تک مستقبل کی اسرائیلی ریاست کی ۸۰ فیصد اراضی کے نجی مالک عرب تھے۔

بہت سے صیہونیوں نے بھی تقسیم کے اس منصوبے کو مسترد کر دیا تھا۔ اسرائیل مورخ اوی شیلم کے مطابق یہ صیہونی خواہشات سے کم تھا۔ وہ پورے فلسطین اور یروشلم پر اسرائیلی ریاست کا

قیام چاہتے تھے۔ یہی وہ مذہبی اسرائیل تھا جس کی بات ان کی مذہبی کتب میں کی گئی ہے۔ اس وقت خفیہ عسکری تنظیم ارگن (Irgun) کا سربراہ مینا ہم بیگن تھا۔ جو بعد میں وزیراعظم بنا اور اسے نوبیل پرائز سے بھی نوازا گیا۔ اس نے بہت سے یہودی قوم پرستوں کے جذبات کا اظہار یہ کہہ کر کیا تھا کہ ''فلسطین کی تقسیم غیر قانونی ہے۔ اسے کبھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ یروشلم ہمیشہ سے ہمارا تھا اور وہی ہمارا دارالحکومت ہوگا۔ عوام کے لئے مذہبی ریاست اسرائیل ضرور قائم کی جائے گی۔ جو پورے علاقے پر مشتمل ہوگی اور جو ہمیشہ قائم رہے گی۔

صیہونیوں میں موجود ٹھنڈے مزاج کے لوگ غالب رہے۔ ہمیشہ عملیت پسندی کا ثبوت دینے والے شخص بن گوریان نے سمجھ لیا کہ اقوام متحدہ کی طرف سے جس علاقہ کو اسرائیل کہا گیا ہے، اسے عالمی سطح پر تسلیم کرلیا جائے گا اس لئے وہ اس تاریخی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر یہ کہہ کر کہ یہ ایک اچھی ابتداء ہوگی، اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۱۸۱ کو تسلیم کرلیا۔ دس سال قبل جب صیہونی رہنماؤں کے درمیان پہلی بار علاقے کی تقسیم پر گفتگو شروع ہوئی تو بن گوریان نے دلیل دی تھی کہ ''مجھے یقین ہے کہ ملک کے باقی تمام حصوں کے بارے میں معاملات طے کرلیں گے چاہے یہ کام عرب ہمسایوں کے ساتھ معاہدے اور باہمی گفت وشنید کے ذریعے ہو یا کسی اور طریقے سے۔ یہودی ریاست فوری طور پر قائم کرو۔ چاہے یہ تمام زمین پر نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ باقی زمین وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس آ جائے گی اور یہ ضرور آئے گی''۔

اس مشکل ترین صورتحال کے دوران جب لوگوں میں اتفاق رائے نہیں تھا اور اسرائیلی ریاست کا قیام ناممکن نظر آتا تھا، یورپ کو دو جنگوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس وقت امریکہ نے سوویت یونین کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا اور اس کی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز تھی اور عرب ریاستیں آزادی کی طرف آہستہ روی سے بڑھ رہی تھیں کہ صیہونیوں نے یکطرفہ طور پر ۱۴۔ مئی ۱۹۴۸ء کو ریاست کا اعلان کردیا اور یوں اسرائیلی ریاست وجود میں آ گئی۔

اگلے ہی روز عربوں نے جنگ کا اعلان کردیا۔

اس جنگ، جسے اسرائیلی جنگ آزادی اور فلسطینی النکبہ یعنی تباہی یا آفت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کو چھ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ ان ساٹھ برسوں میں پانچ جنگیں ہوئیں اور ان

گنت جانیں ضائع ہوئیں لیکن معجزاتی اسرائیلی ریاست نہ صرف موجود ہے بلکہ تمام اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کر کے انہیں تباہ و برباد کر رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ناپائیدار جغرافیے کے عین بیچ میں یہودی قوم کے لئے ایک پائیدار گھر حاصل کر لیا گیا ہے۔ آج اسرائیل ایک خوشحال اور محفوظ ریاست ہے۔ اس کی معیشت ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہی ہے اور اس کی فوج علاقے کی مضبوط ترین عسکری قوت ہے۔ اسرائیلی ریاست میں بہترین یونیورسٹیاں ہیں اور اس کی آبادی مشرق وسطیٰ کی تعلیم یافتہ آبادی سمجھی جاتی ہے۔ یہ دنیا بھر کے یہودیوں کے لئے پناہ گاہ ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ یہ ریاست مکمل طور پر پستی میں سمجھے جانے والے یہودی عوام کی طاقت، مدافعت اور ان کی فراست کا بھی نمونہ بن کر سامنے آ چکی ہے۔

فلسطین کی ریاست محض ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ دنیا کے ایک کروڑ سے زائد فلسطینیوں میں سے آدھے لوگ مہاجر بن کر رہ رہے ہیں۔ ایک متحد ریاست کی امید حماس اور الفتح کے درمیان جاری خانہ جنگی کے بوجھ تلے دفن ہو گئی ہے۔ ایک سیکولر ریاست اور دوسرا مذہبی قوم پرستی کا نعرہ لگا رہا ہے۔ آج غزہ، خطہ زمین کا غریب ترین اور گنجان ترین آبادی والا علاقہ کہلاتا ہے۔ جبکہ مغربی کنارے کا تقریباً آدھا حصہ اسرائیلی قبضے میں ہے۔

گذشتہ چھ دہائیوں کے دوران اسرائیل اور فلسطین جیسی قومی روائتوں نے جس طرح اسے مشغلہ سمجھا ہے، وہ کھیل اب پرانے یروشلم اور دیوار گریہ تک محدود نہیں رہا بلکہ مشرقی یروشلم میں اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کو الگ الگ رکھنے کیلئے دفاعی طور پر تعمیر کی گئی علیحدگی کی دیوار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ کنکریٹ سے تعمیر کردہ یہ ہفت رنگی باڑھ، خاردار تاروں کی دیوار، الیکٹرک کی چار دیواری، مسلح فوجیوں کے لئے بنائے گئے ٹاور اور چیک پوائنٹس دیوار برلن سے چار گنا زیادہ طویل اور بعض مقامات پر اس سے دوگنا بلند رکاوٹیں ہیں۔ یہ دیواریں صرف یروشلم میں فلسطینیوں کی ایک لاکھ چالیس ہزار ایکڑ زمین پر تعمیر کی گئی ہیں۔ نتیجے کے طور پر آخر کار مغربی کنارے کی چالیس سے پچاس فیصد زمین ان دیواروں کے نیچے دب جائے گی اور یوں ایک یک رنگ فلسطینی ریاست کا قیام مذاق بن کر رہ جائے گا۔ یہ دیوار بڑے شہری اضلاع کو تقسیم کرتی ہے۔ یہ ایسے علاقوں جہاں ایک ہی لسانی اور مذہبی یگانگت رکھنے والے لوگ رہتے تھے اور جہاں پہلے

فلسطینی شہر آباد تھے، کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دے گی۔ کسانوں کو ان کی فصلوں سے جدا کر دے گی، خاندانوں کو تقسیم کر دے گی اور فلسطینیوں کو سکولوں، ہسپتالوں اور کام کرنے والی جگہوں سے جدا کر دے گی۔

اسرائیلی حکومت کو اس بات پر اصرار ہے کہ فلسطینی دہشت گردوں کو اسرائیل سے باہر رکھنے کیلئے باڑھ لگانا ضروری ہے اور یہ اس لئے بھی زیادہ ضروری ہے کہ مقبوضہ علاقوں کی سرحدوں پر پچاس سے زائد آبادیوں میں رہنے والے لاکھوں اسرائیلی آبادکاروں کی جانوں کا تحفظ ممکن بنایا جا سکے۔ اگرچہ اس دیوار کی تعمیر سے یروشلم میں خودکش حملوں میں نمایاں کمی آئی ہے، تاہم ستم ظریفی یہ ہے کہ اسرائیل کے وجود کو سب سے زیادہ خطرہ عرب فوجوں یا فلسطینی جنگجوؤں سے نہیں بلکہ خود اس دیوار سے ہے۔ یہ دیوار محض فلسطینیوں کے منفی رویوں کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے منفی ردعمل کی نمائندہ بن چکی ہے جن کے لئے دو قومی ریاستوں کے درمیان سرحدی ٹکراؤ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی عنایات کا حقدار کون ہے۔ اس حق کے دعووں پر ہونے والا تصادم کائناتی جنگ کی شکل اختیار کر چکا ہے جسے کوئی دیوار، چاہے وہ کتنی طویل اور کتنی اونچی ہی کیوں نہ ہو، نہیں روک سکتی۔

۷ جولائی ۲۰۰۵ء کو برطانیہ کے شہر ویسٹ پارک شائر میں مقیم خوش خلق اور نرم لہجے میں گفتگو کرنے والا پاکستانی نوجوان محمد صدیق خان اپنے تین دوستوں کو لے کر خودکش مشن پر روانہ ہوا جس کے نتیجے میں کم از کم پچاس برطانوی شہری ہلاک ہو سکتے تھے۔ وہ دیوار گریہ کے پانچ سو سیکورٹی چیک پوسٹوں میں سے ایک پر کھڑا ہو گیا۔ ۷ جولائی کے اس وقعہ کے بارے میں بہت سا مواد شائع ہوا۔ دستاویزات تیار کی گئیں، کانفرنسیں منعقد ہوئیں صرف یہ جاننے کیلئے کہ ان چار معصوم اور حلیم مزاج کے برطانوی نوجوانوں کا مقصد کیا تھا، اور وہ انتہا پسندی کی طرف کیوں راغب ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نوجوان کی زندگی میں یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ایک شوہر اور باپ جو زندگی کی تمام آسائشوں سے بہرہ مند تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا تو پھر کیا وجہ تھی کہ وہ انتہا پسند جہادی بن کر لوگوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

صدیق خان نے یہ سب کچھ کرنے کا فیصلہ اچانک کیا اور وہ بھی تب جب وہ اپنی بیوی اور چند دوستوں کے ہمراہ حج کر کے برطانیہ واپس آ رہا تھا۔ جب وہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہوئے تو

خان نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کی تذلیل ہوتے دیکھی جنہیں اپنی زندگیوں پر کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ اپنی مرضی سے فلسطین میں گھوم پھر سکتے تھے۔

مجھے اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے جو کہانی سنائی، اس کے مطابق خان سرحد پار کر گیا اس کا برطانوی پاسپورٹ اس کے راستے میں حائل رکاوٹیں ختم کرنے کا باعث بنا۔ اندر جا کر اس نے ایک بوڑھے فلسطینی کو دیکھا، جو اس بنجر زمین ہی کا باسی تھا، جس کے ساتھ ایک زود حس نوجوان سپاہی بدتمیزی کر رہا تھا۔ اس سپاہی کی عمر پھنسیاں زدہ چہرے والے اس امیگریشن آفیسر کی عمر کے تقریباً برابر ہی ہوگی جس نے مجھے تل ابیب میں داخل ہوتے وقت ایک طرف کھینچ لیا تھا۔ ایک دوسرا سپاہی پسینے میں شرابور تھا اور ڈرپوک لگ رہا تھا اور وہ عمر میں پہلے سپاہی جتنا ہی تھا، اس بوڑھے فلسطینی کی چھاتی پر رائفل کی نالی رکھے کھڑا تھا۔ ماضی میں اس جگہ پر کئی حملے ہو چکے تھے، جن میں بہت سے اسرائیلی اور یہودی ہلاک ہوئے تھے۔

بوڑھے آدمی نے اپنا سر جھکا دیا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ جب سپاہی اس کی تلاشی لے رہا تھا تو وہ بالکل خاموش تھا۔ خان بھی اس کے ساتھ ہی خاموش کھڑا تھا۔ لیکن بوڑھے آدمی کے ساتھ ہونے والی اس بدسلوکی نے اس کا سر گھما دیا تھا۔

محمد صدیق خان عرب نہیں تھا۔ وہ عرب دنیا میں زیادہ گھوما بھی نہیں تھا اور بقول اس کے دوستوں کے، خان کو عرب دنیا میں گھومنے پھرنے میں دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس نے کبھی بھی فلسطینیوں کے حالات پر زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس علاقے میں یہ اس کا پہلا دورہ تھا۔ اس دورے سے پہلے وہ کوئی نمازی پرہیزگار بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس بدقسمت لمحے میں اس کی شناخت میں تغیر آیا۔ اب وہ برطانوی نہیں تھا اور نہ ہی وہ پاکستانی رہا تھا۔ نہ ہی اس کی قوم پرستی اس کے ہونے کے احساس کو دبا سکی تھی۔ وہ صرف ایک سادہ سا مسلمان تھا۔ ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی تصوراتی قوم کا رکن جو یہودی قوم کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی کائناتی جنگ میں مصروف تھی۔ یہودی قوم بھی وہ جو محض تصوراتی اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔

جنوبی لیڈز کے قلب بیسٹن میں جہاں وہ اور ے جولائی والے خودکش حملے میں حصہ لینے والے اس کے ساتھی رہتے تھے، اس نرم رو نوجوان نے اپنے ساتھیوں کو اپنی نئی شناخت کے ساتھ ساتھ اپنے ارادے کا اعلان کر کے چونکا دیا۔

وہ چیخا ''وہ ہمیں قتل کرتے ہیں، اس لئے ہمیں ان کو قتل کر دینا چاہیے''۔

اس کے ساتھی پریشان ہو گئے۔ وہ حیران تھے کہ خان کا کیا مطلب ہے؟

دو سال بعد اپنے اس انتہاء پسندانہ اقدام سے پہلے اس نے اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی ویڈیو شہادت میں اس الجھاؤ کو صاف کر دیا۔ اس نے اس ویڈیو میں برطانیہ کی قومی حکومت، اپنی قومی حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے اس پر الزام لگایا کہ ''تمہاری منتخب جمہوری حکومتیں دنیا بھر میں میرے لوگوں کے خلاف مسلسل بہیمانہ مظالم ڈھا رہی ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہوئے تم اس کے براہ راست ذمہ دار ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کا تحفظ کرنے اور ان کا انتقام لینے کا ذمہ دار ہوں۔

ہم سب نے ایسے یا اس جیسے الفاظ اس سے پہلے بھی کئی بار سنے ہیں۔ یہ الفاظ خودکش ویڈیوز اور ان بصری شہادتوں میں عام طور پر استعمال وتے ہیں جو جہادی عموماً اپنے مشن پر روانہ ہوتے وقت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی سماجی تحریک کی طرح، جہادازم کو سب سے بڑا چیلنج ایک مشترک شناخت میں داخل کرنا ہوتا ہے۔ سماجیات کے علوم کے ماہر ولیم گیمسن کے مطابق اس کا آسان طریقہ ناانصافی اور ظلم کو ایک شکل دینا ہے۔ کسی صورتحال کو ناواجب قرار دے دو، ناانصافی کا کسی پر الزام دھر دو، ناانصافی اور اس کے ذمہ داروں سے نمٹنے کا حل بتا دو، اور سب سے اہم یہ کہ اس ناانصافی کو ایک بڑے فریم کے ساتھ جوڑ دو تا کہ ایک یک رنگی پیغام دوسروں تک پہنچے اور اس پیغام کی گونج دور دور تک جائے گی۔

کامیاب فریمنگ اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے غصے اور خفگی کے مبہم اور غیر واضح احساسات کو ٹھوس شکل دینا آسان ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے مقامی سطح کی شکایات اور خفگی کو عالمی صورت دی جاسکتی ہے۔ چاہے ان کا آپس میں کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ذریعے تحریک کے رہنماؤں کو اپنے ارکان کی متضاد خواہشات اور وسیع تر مفادات کا احاطہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

نام نہاد ''فریم الائمنٹ ٹیکنیک کے ذریعے جہادازم جیسی تحریکوں کے لئے داخلی اور خارجی گروہ قائم کرنا آسان ہوتا ہے۔ ان سے دشمن کو شناخت کرنے اور اس سے بھی زیادہ دشمن کو رسوا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان سے تحریک کے رہنماؤں کو مدد ملتی ہے کہ وہ غیر جانبدار تماشائیوں کو یا تو اپنی تحریک کے مقصد کے ساتھ جوڑ لیں یا پھر انہیں مخالف بنا لیں۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد

لوگوں کو مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ تحریک میں شامل ہو جائیں اور ان کی تکالیف کے ازالے کیلئے کچھ کریں۔ مختصراً یہ کہ فریمنگ سماجی تحریک کے ارکان کیلئے مشترکہ شناخت کو مشترکہ اقدام میں تبدیل کرنے کے مشکل کام کو آسان بنا دیتی ہے اور مشترکہ اقدام کی آسان ترین شکل تشدد اور وہ بھی منظّم اور مذہبی تشدد ہے۔ جس کے ذریعے سے ایسے پیچیدہ اور مختلف صورتیں اختیار کئے ہوئے ان جھگڑوں کو نئی شکل دی جا سکتی ہے جن کا الزام کسی پر بھی دھرنا آسان نہیں ہوتا۔

آج کے دور میں اسرائیلی قبضے کے تحت فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم سے کہیں زیادہ وہ ناانصافی ہے جس نے مسلمانوں کے ذہنوں کو محیط کر رکھا ہے۔ خاص طور پر عرب دنیا میں شاید ہی کوئی پرائمری یا سیکنڈری سکول ہوگا جہاں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو انہی کی عمر کے لڑکے لڑکیوں پر روزانہ ہونے والے تشدد کے بارے میں بتایا نہ جاتا ہو۔ انہیں یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے بچوں پر جو ظلم و تشدد کیا جاتا ہے اس کا تصور بھی محال ہے۔ انہیں ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرنے کی کہانیاں دوہرائی جاتی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں فلسطینیوں کے ابتر حالات کو مطالعہ تاریخ عرب کے ایک باب کے طور پر ویسے ہی پڑھایا جاتا ہے جیسے امریکی تاریخ میں سول وار کا مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے مسلم دنیا میں پین اسلامک شناخت کا واحد ذریعہ فلسطین بن چکا ہے۔ جسے ایک عالمی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ خلافت کی غیر موجودگی میں یہی ایک علامت تمام مسلمانوں کو، چاہے وہ کسی نسل، طبقے، زبان اور قومیت سے تعلق رکھتے ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتی ہے، انہیں اکٹھا کرتی ہے، واحد امّہ کی شکل دیتی ہے۔ ایران کے حالیہ دورے کے دوران ایک ہائی وے کے اوور پاس پر دو بہت بڑی تصویروں کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پہلی تصویر پر ایک معروف شبیہ بنی تھی جس کے بارے میں ۲۰۰۰ء میں بی بی سی نے اپنے عالمی پروگرام میں اجاگر کیا تھا۔ یہ شبیہ ایک فلسطینی شخص جمیل الدورا کی تھی جسے کنکریٹ کے بنے ایک بلاک کے پیچھے زمین پر ایسے بیٹھا دکھایا گیا تھا جیسے وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو قریب کھڑے اسرائیلی فوجیوں کی بندوقوں سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ دوسری تصویر پہلی تصویر سے کہیں زیادہ مشہور ہوئی۔ اس میں ابوغریب میں نقاب پہنے اور چادر میں لپٹے ایک عراقی قیدی کی تھی جو ایک بکس پر ننگے پاؤں کھڑا ہے، اس کے ہاتھ ایسے پھیلے ہوئے ہیں جیسے اسے صلیب پر لٹکایا گیا ہو اور اس کی انگلیوں میں سے

بجلی کی باریک تاروں کی طرح کی کانٹے دار تاریں پھوٹ رہی ہوں۔ پہلی تصویر کے نیچے لکھا تھا ''گذرے ہوئے کل کا فلسطین'' اور دوسری تصویر کے نیچے لکھا تھا ''آج کا عراق''۔

بلاشبہ فلسطینی انتہائی برے حالات میں زندگی گزار رہے تھے لیکن جہادیوں کے لئے فلسطین ایک تصور ہے، ایک علامت ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو ان کے مقصود کی طرف لانا ہے۔ یہ ریاستی وجود کے لئے فلسطینیوں کی جدوجہد نہیں جو بہت سے جہادیوں کو ترغیب دیتی ہے۔ عالمی نظریہ کے طور پر جہادازم اس قسم کے قومیتی مسائل سے بالاتر ہے۔ جہادی جنگجو حماس سے جڑے ہوئے جنگجوؤں کے شانہ بشانہ جنگ کرنے کیلئے فلسطین نہیں جاتے۔ اور اگر وہ ایسا کریں بھی تو وہاں پر ان کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا۔ جہادی نظریہ سازوں نے فلسطین کی صورتحال پر قابو پانے کیلئے کوئی خصوصی منصوبہ بندی کبھی نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے اسرائیل کو سمندر میں دھکیلنے کی کبھی کوئی تجویز پیش کی ہے۔ جہادی اس قسم کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے اور احمقانہ قرردے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بن لادن اور ظواہری جیسے جہادی رہنما اکثر اوقات اس لئے اسرائیل اور امریکہ کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی قبضہ میں فلسطینیوں پر ہولناک مظالم کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن وہ ایسی شکایات کو چاہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہوں، جہادیوں کی تکلیفوں کی وسیع تر فہرست کے حصے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ معاملات تو اتنے بے ضرر اور معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں لیکن وہ ان کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس کے باعث یہ چھوٹی موٹی باتیں فلسطینیوں کی ہولناک تکالیف پر بھاری دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس حوالے سے انٹرنیشنل کریمنل کورٹ پر امریکہ کا رضامند نہ ہونا یا گلوبل وارمنگ میں امریکی کردار کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اسامہ بن لادن لکھتا ہے ''تم نے دوسرے ملکوں کی نسبت صنعتی فضلہ اور گیسوں کے ذریعے خلائی ماحول کو زیادہ تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس کے باوجود تم کیوٹو معاہدے پر اس لئے دستخط نہیں کرتے تاکہ تم اپنی لالچی صنعتوں اور کمپنیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ منافع کما سکو''۔ وہ امریکہ کے مالیاتی قوانین پر برستا ہے اور کہتا ہے کہ ان قوانین کا مقصد ان امیروں اور دولت مندوں کو فائدہ پہنچانا ہے جو انتخابات میں حصہ لینے والی پارٹیوں کو مالی امداد مہیا کرتے ہیں۔ بھلا بتایئے کہ اس سب کچھ کا فلسطینیوں کی جدوجہد سے کیا تعلق بنتا ہے۔ وہ اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ جہادیوں نے ۲۰۰۰ء مین جارج ڈبلیو بش اور الگور کے

درمیان ہونے والے انتخابات کے دوران فلوریڈا میں ووٹوں کی دوبارہ گنتی کے وقت اس الیکشن دھاندلی کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے۔

جہادیوں کے لئے یہ حقیقی مسائل نہیں ہیں۔لیکن مقصد صرف یہ تھا کہ اس طرح دنیا بھر میں ان کی آواز پر توجہ مرکوز ہو جائے جس کے نتیجے میں اس دیوار کے خلاف نفرت جنم لے سکے گی جس نے امّہ کو ریاستوں، قومیتوں، نسلی، ثقافتی اور طبقاتی طور پر تقسیم کر رکھا ہے۔ اور یوں ایک واحد مشترکہ شناخت جنم لے سکے گی جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دے گی اور مسلمانوں پر واضح ہو سکے گا کہ ان کی مشکلات، فلسطینی، چیچین یا کشمیریوں کی مشکلات سے مختلف نہیں اور یوں مسلمانوں اور مغربی دنیا کے درمیان تصادمات کو سچ اور جھوٹ کی طاقتوں کے درمیان کائناتی جنگ کی شکل دی جا سکے گی۔ ایمان والوں اور ایمان نہ رکھنے والوں، اچھے اور برے تمام مسلمان، یہودی اور عیسائی مل کر اس کائناتی جنگ کو جیتنے کیلئے اس میں شریک ہوں۔

محمد صدیق نے اپنی ویڈیو پیغام کو یہ کہہ کر ختم کیا کہ ''ہم حالت جنگ میں ہیں اور میں ایک سپاہی ہوں۔

☆☆☆

حصہ دوم

جنگجو خدا

باب سوم

تمہارے گھر کی خواہش میں میرا ضیاع

وہ محض ایک اتفاق اور بے مطلب سا فقرہ تھا جو تحریر میں نہیں تھا اور نہ ہی قابل توجہ تھا۔ اور اسے کسی سیاستدان نے ادا نہیں کیا تھا جو عوام کے سامنے ہر قسم کی بات کہہ دیتے ہیں اور بعد میں اسے زبان کی لغزش قرار دے کر خاموشی کی چادر تان لیتے ہیں جبکہ یہ ایک صدر کے منہ سے نکلا ہوا فقرہ تھا جس کی تقریریں مذہبی رمزوں سے مزین ہوتی تھیں۔ یہ فقرہ بے ساختہ تھا۔ جیمز کیرول اس فقرے کے بارے میں لکھتا ہے ''مجھے یہ فقرہ بیس بال ریفرنس جیسا برجستہ لگا۔ جس نے ہلا کر رکھ دیا''۔

میں نے یہ بیان ٹیلی ویژن پر دیکھا اور ان لاکھوں امریکیوں اور پوری دنیا کے کروڑوں لوگوں کی طرح فوراً سمجھ لیا کہ نئی صدی میں ظہور پذیر ہونے والا صدمہ یا دکھ ایک عہد یا زمانے کے لوگوں کے نام کر دیا گیا ہے۔

صدر بش نے اپنی تقریر میں کچھ توقف کرتے ہوئے کہا ''یہ صلیبی جنگ، دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ (توقف) ایک عرصے تک جاری رہے گی''۔

''صلیبی جنگ''

یہ لفظ ایک ان چلے بم کی طرح ہوا میں کافی مدت تک معلق رہا اور اپنے لاتعداد معانی اور مفاہیم کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں سے چپکا رہا۔

صلیبی جنگ (اسم خاص): قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف

شروع کی جانے والی مذہبی جنگیں۔

صلیبی جنگ کا مطلب ہے ''مقدس جنگ''۔ یہ اصطلاح صلیبی جنگوں ہی سے نکلی۔ یہ محض ایک لفظ نہیں ہے بلکہ اس دور کی علامت ہے جب ایک وحشی، مذہبی سلطنت نے ایک دوسری وحشی اور مذہبی سلطنت کے خلاف حضرت عیسیٰ کی صلیب کو بطور تلوار استعمال کیا۔ کیرل لکھتا ہے کہ صلیبی جنگیں صرف فوجی معرکے نہیں تھے بلکہ فیصلہ کن واقعات تھے جن سے خصوصاً اسلام کے خلاف ایک مشترکہ مغربی شناخت کو شکل ملی۔

امریکیوں کی بھاری اکثریت جو پہلے ہی مذہب کے حوالے سے شدید جذباتی ہو رہی تھی، اس اصطلاح کا مطلب سمجھ گئی۔ اس طرح عرب اور مسلم دنیا کے ان عوام کی بڑی تعداد اس فقرے میں چھپے مقاصد کو جان گئی جو پہلے ہی صدر بش کے مذہبی تعصب سے پریشان تھی۔ صدر بش نے صدارت سنبھالتے ہی ایسے اقدامات کیے اور بیانات جاری کئے جن سے ان کا مذہبی تعصب جھلکتا تھا۔ صلیبی جنگ (کروسیڈ) کا عربی زبان میں ترجمہ ''حرب الصلیب'' کیا گیا۔ پریس نے بش کے اس بیان کو ''صلیب کی جنگیں'' کہہ کر پیش کیا۔ ''صلیب کی یہ جنگ..... دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ.....''۔

اگلے ہی چند ہفتوں میں صدر بش نے جلد بازی میں متضاد بیان جاری کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یقین دہانی کرائی کہ ان کی نیت اسلام کے خلاف کسی قسم کی مہم چلانے کی نہیں تھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ''ہمارے بہت سے مسلمان دوست امریکہ کے دشمن نہیں ہیں''۔ اس کے ساتھ ہی ان کے مشیروں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر یہ وضاحت دینا شروع کر دی کہ بش نے جو اصطلاح استعمال کی تھی، وہ تاریخی حوالے سے استعمال نہیں کی تھی۔ یہ اصطلاح غلط کام کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنے کے حوالے سے استعمال کی گئی تھی۔ اور لفظ ''صلیب'' کو ''جارحانہ مہم'' کے معنوں میں استعمال کیا گیا تھا۔

میں نے ان کے عذر اور وضاحتوں کو تسلیم تو کر لیا لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سب بے معنی تھا اس لئے نہیں کہ میں غلطی کو درگزر کرنے کا اہل نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے وجدانی ردعمل کے باعث وہ شخص جس کی طرف پوری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں کہ وہ اس واقعہ سے کچھ نتائج اخذ کرے گا، اچانک غیر ارادی طور پر گھبرا گیا تھا، اور اس نے نئی صدی کے

پہلے بڑے تصادم کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ بش نے ''دہشت گردی کے خلاف اس جنگ کو''، جس کی اس وقت تک کسی نے وضاحت نہیں کی تھی، ''صلیبی جنگ'' قرار دیدیا۔ اس طرح اس نے امریکیوں کو روحانی عدسہ مہیا کر دیا جس کے ذریعے مسلم دنیا کے ساتھ پیش آنے والے تصادم کو دیکھا جا سکے (اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے امریکیوں کو اس معاملے میں حوصلہ دینے کی ضرورت نہیں تھی) اس نے اس واقعہ کو کائناتی ثنویت کے ساتھ ایک سوچا سمجھا منصوبہ قرار دیدیا۔ صدر کے بیان کے چند روز بعد بن لادن نے ایک اخباری نمائندے کے ساتھ گفتگو کرتے وقت خوشی سے تمتماتے ہوئے اعلان کیا کہ ''مسیحی صلیبی جنگ کی صورت میں ہمارا عزم تمام مسلمان قوم کو متحد کرنا ہے..... بش نے خود اسے صلیبی جنگ کہا ہے لوگ اس کے بیان پر بش کی طرف سے معافیاں مانگ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ بش کی بات کا مطلب صلیبی جنگ قطعی نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے خود یہ بات کہی تھی۔'' بن لادن نے مزید کہا ''انوکھی بات یہ ہے کہ اس نے ہمارے منہ سے لفظ چھین لئے ہیں''۔

عربوں کے ذہنوں میں صلیبی جنگوں کا خوف عرصہ سے موجود تھا لیکن یہ نوآبادیاتی دور سے آٹھ سو برس قبل کی بات ہے۔ اس وقت چھاتیوں پر صلیبیں لٹکائے سردار سرزمین مقدس کو ''بے دین مسلمانوں'' سے ''پاک'' کرنے کیلئے حملہ آور ہو جاتے تھے۔ لیکن نوآبادیاتی دور میں یہی تصور مغرب کے سامراجی آقاؤں کے مفادات کے شکل میں تبدیل ہو گیا اور اسے اسلام کے خلاف مسیحی جارحیت کی ایک علامت سمجھا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے ایک نہایت بااثر اسلامی مفکر سید قطب نے لکھا کہ ''مغرب میں رہنے والے تمام لوگوں کے خون میں صلیبی ''مجاہدین'' کی روح گردش کر رہی ہے''۔

صلیبی جنگ اور نوآبادیاتی نظام کے درمیان، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسیحیت اور مغربی استعماریت کے درمیان تعلق تبھی سے عربوں کی نفسیات پر چھایا ہوا ہے۔ بہت سی مسلم اکثریتی ریاستوں میں اب بھی یہی بنیادی حوالہ ہے جس سے یورپ اور شمالی امریکہ کے ساتھ تعلقات کو دیکھا جاتا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۵ء میں جب ڈنمارک کے اخبار مورجینا وژن جائی لینڈز۔ پوسٹن'' میں حضور اکرم ﷺ کے گستاخانہ خاکے شائع ہوئے تو پورے یورپ میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اس کے جواب میں ایک مسلمان کارٹونسٹ نے اپنا خاکہ بنایا جس میں اس نے خود کو صلیبی

جنگ کا سردار دکھایا جس کی زرہ بکتر پر ڈنمارک کا قومی پرچم بنا ہوا تھا (سرخ خون کی صلیب) وہ گھوڑے پر سوار اور ہاتھ میں پنسل کو بطور نیزہ پکڑے ہوئے تھا۔

جہادیوں کیلئے صلیبی جنگیں تاریخی واقعات کی بجائے نظریاتی ترکیب اور سوچ ہیں۔ ایک ایسی مضبوط داستان جس کا آخری باب ان دنوں افغانستان اور عراق کے جنگی محاذوں پر لکھا جا رہا ہے۔ اب اکیسویں صدی میں یہ معاملہ یورپ اور امریکہ تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ اب یہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی کائناتی جنگ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ بن لادن نے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں اعلان کیا کہ ''یہ جنگ القاعدہ اور امریکہ کے درمیان نہیں بلکہ یہ بین الاقوامی صلیبی جنگجوؤں کے خلاف مسلمانوں کی جنگ ہے''۔

اشتعال دلانے والے دعوؤں اور اعلانات کو مسترد کرنا آسان نہیں۔ جس طرح صلیبی جنگوں نے بکھرے ہوئے یورپ کے آپس میں متصادم شہزادوں کو مذہب کے نام پر ایک مشترکہ دشمن کے خلاف متحد کر دیا تھا، اسی طرح حقیقی اور تصوراتی غیر ملکی جارحیت نے مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کر دی ہے اور اس طرح بکھرے ہوئے مسلمانوں اور ٹوٹی پھوٹی مسلم دنیا کو ایک جھنڈے تلے جمع کر لیا ہے۔ ''بش نے کہا ہے یا تو تم ہمارے ساتھ ہو اور یا پھر تم دہشت گرد ہو''۔ بن لادن نے بش کے فقرے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا ''(میں کہتا ہوں) تم یا صلیبیوں کے ساتھ ہو یا پھر اسلام کے ساتھ''۔

صلیبی جنگیں کائناتی جنگ کی واضح مثال تھیں۔ انہیں ایسا متبرک تصادم سمجھا جاتا تھا جو زمین اور آسمانوں میں بیک وقت جاری تھا۔ مادی سطح پر یہ ''مقدس جنگیں'' خارجی طور پر (یعنی یہودیوں اور مسلمانوں کے خلاف) اور داخلی طور پر (آزاد خیال یا بدعتی عیسائیوں اور منحرف سرکش شہزادوں) کلیسا کے دشمنوں کے خلاف پوپ کے اختیارات کے حوالے سے تھیں۔ یہ ایک انتہائی گنجلک جال تھا جسے بننے کا مقصد ریاست کے معاملات میں پوپ کی یا کلیسا کی مداخلت کو یقینی بنانا تھا۔ اس طرح پوپ عطیات اور ٹیکسوں کے ذریعے جو دولت اکٹھی کرتے وہ ان صلیبی جنگوں پر خرچ کی جاتی۔ اس طرح کلیسا اور بادشاہوں کے درمیان ایک نئے مالیاتی تعلق نے جنم لیا اور یوں تمام دولت اور عسکری قوت کا ارتکاز پوپ کے ہاتھوں میں ہو گیا۔ جو لوگ پوپ کی چلائی جانے والی اس مہم میں بطور رضا کار شرکت کرتے، انہیں نہ صرف ان کے گناہوں کی معافی دے دی جاتی

بلکہ ان کے قرضے معاف کر دیئے جاتے، ان کے خلاف موجود مقدمے ختم کر دیئے جاتے، یہاں تک کہ ان سے وعدے کئے جاتے کہ مسلمانوں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے بعد انہیں زمین میں سے حصہ بھی دیدیا جائے گا۔

علاوہ ازیں صلیبی جنگوں کو کلیساؤں کی طرف سے نجات بھی مل جاتی۔ یہ سب کچھ شعوری طور پر کیا گیا تا کہ عام لوگوں کو ان جنگوں میں شامل ہونے کی ترغیب مل سکے۔ اس جنگ کو عبودیت کا عمل قرار دیا گیا جس کا مقصد ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن نے کلر ماؤنٹ کونسل کے اجلاس میں بیان کیا کہ جو لوگ کلیسا کے دشمنوں کے خلاف لڑیں گے، ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ پوپ اربن نے کہا ''میں یا خدا، آپ کو مسیح کے پیامبر کی حیثیت دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ حقیر اور بے وقعت نسل (مسلمان) کو ہمارے دوستوں کی زمینوں سے نہ صرف نکال باہر پھینکو بلکہ اسے نیست و نابود کر دو''۔ اربن نے پادریوں، سرداروں اور شہزادوں کو ایک چھوٹے سے فرانسیسی شہر میں جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''وہ تمام جو زمین پر یا سمندر میں یا ملحدوں کے خلاف لڑتے ہوئے مرتے ہیں، ان کے گناہ فوراً معاف کر دیئے جائیں گے۔ یہ میں اس اختیار کے حوالے سے کہہ رہا ہوں جو مجھے خدا نے دیا ہے''۔

اربن پہلا پوپ نہیں تھا جس نے کلیسا کی طرف سے لڑنے والوں کو نجات کی نوید دی تھی۔ اس سے دو سو سال پہلے پوپ لیو چہارم اور پوپ جون ہشتم نے بھی اسی قسم کے وعدے لوگوں سے کیے تھے۔ درحقیقت یہ صلیبی جنگیں حال ہی میں شروع نہیں ہوئی تھیں بلکہ یہ مسیحی عسکریت پسندی کا تسلسل تھا جو تقریباً ۳۱۳ عیسوی میں اس وقت شروع ہوا جب شہنشاہ کانسٹنٹائن نے مسیحیت اختیار کی۔ راتوں رات گلیلی کے ایک یہودی سیاح سے متاثر ہو کر یہ مقامی سطح کا مذہب شاہی مذہب بن گیا اور مسیح کی صلیب جنگی پرچم کی شکل اختیار کر گئی۔ اس اچانک کایا پلٹ نے جنگ اور تشدد کے حوالے سے عیسائیوں کے نکتہ نظر میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی۔ حضرت عیسیٰ کے ابتدائی حواریوں کا جو مسلسل ظلم و جبر اور سیاسی عدم استحکام کا شکار تھے، جنگ سے متعلق نکتہ نظر یہ تھا کہ ایک روز حضرت عیسیٰ سفید گھوڑے پر سوار جنگجو کی حیثیت سے واپس آئیں گے، ان کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح ہوں گی، ان کا لباس خون سے تر ہوگا، ان کی زبان تلوار کی دھار کی طرح ہوگی جس سے وہ قہر بن کر ان قوموں پر برسیں گے۔ لیکن روم اور مسیحیت کے انضمام کے ساتھ ہی کلیساء

کے روحانی دشمنوں اور روم کے سیاسی دشمنوں کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ ۱۰۹۹ء میں جب مسیحی جنگجوؤں نے یروشلم کی دیواروں کو توڑا اور جب اربن نے مسیحی جنگجوؤں کو ارض مقدس کو آزاد کرانے کیلئے بھیجا، اس سے چار سال قبل تک مسیحیت خفیہ یہودی فرقہ نہیں رہا تھا۔

اس سے ایک ہزار سال قبل روم نے خود کو یہودی نہ ظاہر کرنے والوں کو باقی یہودیوں کے ساتھ ارض مقدس سے جبراً بیدخل کر دیا تھا۔ یہ روم ہی تھا جو اس وقت ایک امیر لیکن خون کا پیاسا ملک تھا۔ ایجلیز کے ریمنڈ جو پہلی صلیبی جنگ کے دوران خدا کے جنگجو سرداروں کے پابہ رکاب تھا، کا تحریر کردہ روزنامچہ بتاتا ہے کہ یروشلم میں بسنے والوں پر جس قسم کا ظلم وتشدد کیا گیا اس کا تصور ہی لرزا دیتا ہے۔ صلیبی جنگجوؤں نے مسلمانوں اور یہودیوں کے سر قلم کر دیئے، تیروں سے انہیں چھلنی کر دیا اور انہیں آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا۔ شہر کی گلیوں میں ان کے سروں، ہاتھوں اور پاؤں کے ڈھیر لگ گئے۔ صلیبی جنگجو انسانی خون کے سمندر سے گزرتے رہے۔ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو اپنے گھوڑوں کی سموں تلے روندتے ہوئے گزر جاتے اور اس طرح وہ ٹمپل ماؤنٹ پر پہنچے۔ جس کو انہوں نے انسانی خون سے نہلا دیا۔ ریمنڈ لکھتا ہے کہ ''یہ دن تمام مسیحی قوم کی شفاعت اور کافروں کی تذلیل کا دن تھا۔ اس روز ہمارے عقیدے کی تجدید ہوئی''۔

قرون وسطیٰ کے عیسائی فوجیوں کی یہ بے لگام خون آشامی کسی صورت قابل معافی نہیں اس لئے کہ حضرت عیسیٰ نے تو محبت کا درس دیا تھا۔ ان کا فرمان تھا ''اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو اور اگر کوئی تمہیں تھپڑ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو''۔ یہ جو قتل وغارت گری ہوئی یہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے برعکس تھی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ کائناتی جنگ کے بارے میں مسیحیت کا یہ تصور انجیل سے نہیں لیا گیا بلکہ عبرانی انجیل یا عہد نامہ عتیق سے لیا گیا تھا۔ سرداروں نے عورتوں کی عصمت دری کی، ارض مقدس کی طرف لوٹ مار کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔ عیسائی روزنامچہ نگار کین کے راڈلف لکھتا ہے کہ انہوں نے ''کافر'' بالغوں کو ابلتے پانی میں ڈال کر ہلاک کیا، بچوں کے جسموں کے ٹکڑے کر کے انہیں پیس دیا''۔ یہ سب کچھ کائناتی جنگجوؤں کا کارنامہ تھا جو عہد نامہ عتیق کے شیر کا راستہ تھا نہ کہ خدا کی بھیڑ کا۔

کائناتی جنگ کے تصور کا تعلق اس عقیدے پر ہے کہ انسانی جنگوں میں خدا پوری طرح

ملوث ہوتا ہے اور وہ کسی ایک کی طرفداری کرتا ہے۔ عبرانی انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ ''خدا جنگ کا انسان'' ہے۔ ''وہ ایک سپاہی کی طرح آگے بڑھتا ہے، ایک جنگجو کی طرح اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے، وہ چیختا ہے، چلاّ تا ہے اور اپنے دشمنوں کے خلاف خود کو طاقتور ترین بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ خون اچھالنے والا خدا ہے۔ جو اپنے مخالفوں کے لئے بے رحم ہے، اپنے دشمنوں کے لئے ہولناک ہے۔ وہ ''ننگے تیر'' اور ''چمکتے ہوئے نیزے'' اپنے ساتھ رکھ کر اپنے جنگی رتھ پر سوار فتح کی طرف بڑھتا ہے۔ غصے میں وہ زمین کو روند ڈالتا ہے اور غصے میں قوموں کو کچل دیتا ہے۔ جو اس کے خلاف کھڑی ہوتی ہیں، وہ ان کے سر کچل دیتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے دشمنوں کے خون سے غسل کریں۔ اس کا غصہ آسمانوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اپنے غضب سے پہاڑوں کو مروڑ دیتا ہے۔

پرانے زمانے میں خدا کا تصور مختلف تھا۔ جنگ کے دوران خدا غیر منفعل اور غیر متحرک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ خدا ایک سپاہی کی طرح متحرک ہوتا ہے۔ کائناتی جنگ کے حوالے سے مسیحی عقیدہ یہ تھا کہ خدا کی جانب سے انسان جنگ نہیں لڑتے۔ بلکہ خود خدا انسانوں کی جانب سے جنگ کرتا ہے۔ بعض اوقات میدان جنگ میں جنگجو کے طور پر صرف خدا ہی موجود ہوتا ہے۔ جب اہل بابل نے میسو پوٹیمیا فتح کیا تو انہوں نے یہ جنگ بادشاہ کے نام پر نہیں بلکہ اپنے خدا مردوک کے نام پر لڑی تھی جو ہر جنگ کی اجازت دیتا تھا، اس کا آغاز کرتا تھا اور اس کی کمانڈ کرتا تھا۔ یہی صورت مصریوں اور ان کے خدا آمون رے، شامیوں اور ان کے خدا آشور، کنعانیوں اور ان کے خدا ''بعل'' اور خصوصاً اسرائیلیوں اور ان کے خدا ''یہوا'' کے بارے میں بھی تھی۔

انجیل میں بار بار خدا کو اسرائیلیوں کے لئے جنگ کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے جو تعداد میں کم اور جنگی قوت کے طور پر کمزور تھے۔ ''خدا کو اس حوالے سے نہیں روکا جا سکتا کہ وہ زیادہ لوگوں کو بچاتا ہے یا کم لوگوں کو۔ عمومی طور پر اسرائیلیوں کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ پیچھے کھڑے رہیں اور اس عقیدے کو مضبوطی سے تھامے رکھیں کہ خدا ہی ان کیلئے جنگ کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو دیکھ لیجئے کہ وہ سرکنڈوں میں چھپے ہوئے سمندر کے کناروں پر سکون سے کھڑے ہیں اور فرعون کی رتھ گاڑیاں ان کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ اس صورتحال میں اسرائیلی پریشانی کے عالم میں حضرت موسیٰؑ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔ ''ڈرو نہیں۔ مضبوطی کے

ساتھ کھڑے رہو اور دیکھو کہ آج خدا تمہارے لئے نجات کا راستہ کیسے نکالتا ہے''۔ وہ خوف سے کانپتے ہوئے اسرائیلیوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ''خدا تمہارے لئے لڑے گا، تمہیں صرف حرکت کئے بغیر کھڑے رہنا ہے''۔ اپنی چھڑی بلاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی پانی پیچھے چلا جاتا ہے، سمندر خشک ہو کر زمین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مصری بھی میدان جنگ میں خدا کی موجودگی کو تسلیم کرتے تھے۔ ''آؤ اسرائیلیوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں''۔ وہ چیختے ہیں اور کہتے ہیں ''اس لئے کہ مصر کے خلاف ان کے لئے (اسرائیلیوں کے لئے) خدا لڑ رہا ہے''۔

لیکن مصریوں کو بھاگنے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ حضرت موسیٰ نے چھڑی کو پھر حرکت دی اور سمندر پہلے کی طرح بہنے لگا۔ فرعون کی تمام کی تمام فوج اس میں غرق ہو جاتی ہے۔ ''یوں خدا نے اس روز اسرائیل کو مصریوں سے بچایا اور اسرائیل نے ساحل سمندر پر مصریوں کی لاشیں دیکھیں''۔

جنگ میں خدا کی متبرک مداخلت کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی ایک شکل براہ راست اقدام ہو سکتی ہے جیسا کہ کہا گیا کہ ''جب خدا نے پسپا ہوتے لنگوروں کے لشکر پر آسمان سے پتھر پھینکے تو اس کے نتیجے میں جتنے لنگور نما انسان مارے گئے اتنے اسرائیلیوں کی تلواروں سے نہیں مرے''۔ اس کے علاوہ اولوں کی بارش، طوفانی ہوائیں یا ریت کے طوفان اور دشمن کی فوجوں میں قحط یا بیماری کا پھیلنا، متبرک مداخلت کی ہی شکلیں ہیں۔

مداخلت کی کسی بھی شکل سے زیادہ اہمیت اس یقین کی ہے کہ خدا بذات خود میدان جنگ میں بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ ''خدا اسرائیل کی چھاؤنی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ خدا بذات خود زمین پر اپنی فوجوں کی کمان سنبھالتے ہوئے جنگ کے میدان میں پیش قدمی کرتا ہے۔ اور جوں جوں اس کے آس پاس جنگ شدت اختیار کرتی ہے وہ جنگی حکمت عملی طے کرتا ہے۔ اسرائیل کا بادشاہ داؤد خدا سے پوچھتا ہے کہ ''کیا میں فلسطین کے خلاف سامنے سے حملہ کروں؟'' خدا جواب دیتا ہے ''نہیں۔ تم سامنے سے حملہ نہ کرو۔ ان کے پیچھے کی طرف جاؤ اور بام کے درختوں کی مخالف سمت سے ان پر حملہ کرو''۔

جنگ، خدا کی جنگ ہے اور دشمن، خدا کا دشمن ہے۔ حکمت عملی خدا کی تیار کردہ ہے اور فتح بھی خدا ہی کی فتح ہے۔ بلاشبہ جب جنگ شروع ہوتی ہے تو پھر انجیل میں، انصاف اور اخلاقیات کے بارے میں انسانی تصور کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ خدا جو حکم دیتا ہے وہ اخلاقی اور صحیح ہوتا

ہے۔شرائط اور حدود صرف خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔خدا اسرائیل کے ابتدائی بادشاہ ساؤل کو حکم دیتا ہے کہ ''جاؤ اور حملہ کرو اور جو کچھ ان کے پاس ہے تباہ و برباد کر دو، انہیں معاف نہ کرنا اور نہ رعایت دینا بلکہ تمام مرد و زن، بچوں اور معصوموں کو حتیٰ کہ ان کے بیلوں، بھیڑوں، اونٹوں اور گدھوں تک کو قتل کر دو''۔

مکمل فنا کا یہ عمل جس میں خدا تمام سانس لینے والوں کے قتل کی کمان کرتا ہے، وہ موضوع ہے جس کا ذکر تسلسل کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔اسرائیلیوں کا خیال تھا کہ بت پرستی (اجنبی خداؤں کی پرستش) وہ متعدی مرض ہے جس نے آس پاس کی ہر شے کو آلودہ اور ناپاک کر دیا ہے۔ اجنبی قبائل کے خداؤں سے محض علیحدگی، پاکیزگی اور پارسائی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ بت پرستی سے صحیح معنوں میں زمین کو آزاد کرانے اور صرف اسرائیلی خدا کی عبادت کو یقینی بنانے کیلئے ضروری ہے کہ ہمسایہ قبائل کو ختم کر دیا جائے۔''یہوا کے سوا کسی دوسرے خدا کے لئے قربانی دینے والوں کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہیے''۔متعدی مرض کے جراثیم کو روکنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں۔ بلکہ دشمن کی زمین، اس کے جانوروں کے ریوڑ، زیر کاشت اراضی، سونا اور چاندی سبھی کچھ تباہ کر دیا جائے۔خدا مزید کہتا ہے ''تا کہ وہ تمہیں میرے خلاف گناہ پر مجبور نہ کر سکیں''۔

اس حوالے سے جوشوا کی کتاب میں بیان کی گئی بدنصیب اچان کی کہانی دیکھیے۔جریکو کے زوال کے بعد جب اسرائیل نے شہر میں موجود تمام مرد و زن، جوان اور بوڑھے، بیل، بھیڑیں اور گدھے قتل کر دیئے تو اچان نے شہر میں ہونے والی لوٹ مار میں سے اپنے لئے کچھ خفیہ طور پر اپنے گھر کے نیچے چھپا کر رکھ لیا۔جب اس کا علم ہوا تو نہ صرف یہ کہ اچان کو وہ تمام اشیاء لوٹانے پر مجبور کیا گیا تا کہ وہ سب کچھ تباہ کر دیا جائے بلکہ اسے سنگسار کر دیا گیا اس لئے کہ اسے بت پرستی کی طاقت نے ناپاک کر دیا تھا۔اچان کے ساتھ اس کی بیوی، بچوں اور بچوں کے بچوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ان کی لاشوں اور اچان کی تمام جائیداد اور اس کے مویشیوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ بائبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تاریخی واقعات کا تذکرہ نہیں بلکہ ماضی بعید کے واقعات کا مذہبی سوچ کا عکس ہیں۔تاہم آرکیالوجیکل ثبوت ظاہر کرتے ہیں کہ جن قبائل کو نیست و نابود کرنے کا اسرائیلی دعویٰ کرتے ہیں، ان میں سے کچھ کو انہوں نے اپنی قوم کا حصہ بنا لیا تھا۔دینی سکالر جان کولنز کا کہنا ہے کہ ''کائناتی جنگ کا مذہبی تصور

بالکل واضح ہے کہ باہر کے خداؤں کے خاتمے سے ہی معاشرے کو پاکیزہ بنایا جاسکتا ہے''۔ چنانچہ اسی اصول کو اپناتے ہوئے قوم کو تشکیل دیا گیا۔ غیر ملکیوں سے وعدہ کی گئی زمین کو آزاد کرانے کیلئے جوشوا کی فوجوں نے جو قتل عام کیا اور جس طرح خون بہایا اس کی ایک جھلک دیکھیے:

''جوشوا نے مکہ فتح کر لیا۔ اس نے شہر میں رہنے والے ہر ذی نفس کو قتل کیا۔ اس نے کچھ بھی باقی نہ رہنے دیا۔ پھر جوشوا اور اس کے ساتھ پورا اسرائیل لبنان کی طرف بڑھے، اس نے اپنی تلوار کی نوک سے حملہ کیا اور اس میں موجود ہر فرد کو ختم کر دیا، اس نے کسی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ اس کے بعد جوشوا لیجیش پر حملہ آور ہوا اور اس پر اپنی تلوار سے حملہ کیا اور شہر میں موجود ہر فرد کو تلوار کی نوک سے قتل کر دیا۔ لیجیش سے جوشوا ایگلان گیا اور وہاں ہر ذی نفس کو تہہ تیغ کیا۔ پھر جوشوا ایگلان سے ہیرون گیا اور اس کو نیست و نابود کیا۔ پھر جوشوا دبیر کی طرف مڑا۔ پورا اسرائیل اس کے ساتھ تھا اور اس میں موجود ہر فرد کو تباہ و برباد کر دیا۔ جوشوا نے اس علاقے کو نیست و نابود کر دیا۔ اس نے پہاڑی علاقوں کو فتح کیا، نجیب کو فتح کیا، اس نے تمام ڈھلوانوں اور پہاڑیوں کے نیچے کی زمینوں کو تاخت و تاراج کیا اور وہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ اس لئے کہ اس کا حکم اسرائیل کے خداؤں کے خدا نے دیا تھا اور وہی اس کی کمان کر رہا تھا اور یہ سب اس لئے کہ خداؤں کے خدا نے اسرائیل کیلئے جنگ لڑی''۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نامہ جدید کے حوالے سے کائناتی جنگ کا تصور مکمل تباہی کا عمل ہے لیکن آج کے جدید زمانے کے اسرائیل میں چند ایسے بنیاد پرست، دائیں بازو کے یہودی گروہ موجود ہیں جن کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ ہے کہ ''متبرک سرزمین'' کو ''غیر ملکی'' عناصر سے پاک کرنے کا عمل خدائی حکم ہے اور یہ ہونا ضروری ہے چاہے اس کی کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ لیکن پہلے ہزار سال گزرنے کے بعد پہلی صدی کے فلسطین کی پرآشوب زمین پر مذہبی قوم پرستوں کے ایک گروہ نے کائناتی جنگ کے مذہبی عقیدے کی انتہائی خوفناک شکل پیش کی ہے۔ یہ گروہ ''انتہا پسند'' کے نام سے پہنچانا جاتا ہے۔

نوٹ: رومنوں کے زمانے میں فلسطین زمین کے اس بڑے حصے کا نام تھا جو آج کے زمانے میں اسرائیل، فلسطین اور اردن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ ''انتہاپسند'' (Zealots) کوئی باقاعدہ مذہبی گروہ یا سیاسی جماعت نہیں تھی۔ ان کا آپس کا سمبند ڈھیلا ڈھالا سا تھا اور یہ یہودی انقلابیوں کی ناموافق نوعیت کی تحریک تھی۔ جس کا مرکز گلیلی میں تھا۔ گلیلی انقلاب پسندوں اور لوگوں کو اشتعال دلانے والے لوگوں کا مرکز تھا۔ اس علاقے کے رہنے والے آج بھی اس ذلت ورسوائی کو نہیں بھولے جو ان کے آباؤ اجداد کو یروشلم پر رومیوں کے قبضے کے دوران برداشت کرنا پڑی تھی۔ ان میں سے کچھ ''پرجوش'' یا انتہاپسند ارکان کا تعلق پادریوں یا مذہبی رہنماؤں پر متمل خاندان سے تھا۔ لیکن باقی ''پرجوش'' ملّائیت کے خلاف سرگرم تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ پیشن گوئیاں اور دم درود کا کام کرتے تھے جبکہ باقی یہودی مذہب کی تمام صورتوں سے خود کو مکمل طور پر الگ تھلگ رکھتے تھے۔ کچھ ''پرجوش'' امن پسند تھے جبکہ ان کی بڑی تعداد رومی قابضوں اور رومیوں کے ساتھ ملے ہوئے یہودیوں کے خلاف تشدد کے بے دریغ استعمال کی زبردست حامی تھی۔ بہت سے ''پرجوش'' یا انتہاء پسند مفروروں اور ڈاکوؤں کے گروہ بنا کر رہ رہے تھے۔ تاہم اختلافات کے باوجود جس چیز نے ان مجرموں اور انقلابیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ''پرجوش'' تنظیم میں باندھ رکھا تھا، وہ تھی حمیت کے مذہبی نظریہ کی اپیل۔

مذہبی حمیت کا سیدھا سادا مطلب ہے خدا کی فرمانروائی پر غیر متزلزل یقین رکھنا۔ خدائی قانون کے ساتھ مکمل وفاداری کرنا اور اس سے بھی کہیں زیادہ اس کا مطلب ہے خدا کے لوگوں کا اپنے ہمسائیوں سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کرنا۔ خدا کے مقدس کردار ہی سے نظریہ حمیت نے فیضان حاصل کیا تھا۔ ''تمہارا خدا راکھ بنا دینے والی آگ ہے، ایک حاسد خدا ہے''۔ یہ وہ خدا ہے جو کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا، وہ کسی کو اپنا شریک نہیں ٹھہراتا، وہ خود کو کسی ایک حصے کی بجائے کل مانتا ہے۔ وہ مکمل اور غیر مشروط بندگی مانگتا ہے اور اس سارے عمل میں ذرہ برابر کمی پر وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔ اسرائیل کے خدا کی صحیح معنوں میں عبادت کرنے کا مطلب ہے اس کی اوپر دی گئی تمام صفات کو مانتے ہوئے اس کے کہے گئے لفظ، اس کے قانون اور زمین وآسمان پر اس کی ابدی حکمرانی کو تسلیم کیا جائے۔

اس مذہبی جوش وخروش کی سب سے بڑی مثال ہارون (حضرت موسیٰ کے بھائی) کا پوتا فینہاس ہے۔ ان دنوں اسرائیلیوں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ یہ وباء خدا کی طرف سے اپنی خاص

قوم کے گناہوں کی سزا کے طور پر پھیلائی گئی۔ خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے یہودیوں نے اس ہمسایہ ریاست کی خواتین کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ اس کے علاوہ وہ ان خواتین کی خدا کے نام پر قربانیاں بھی دینے لگے تھے۔ اس پر ناراض ہو کر خدا نے موسیٰ کو ہدایت کی کہ وہ کمیونٹی کے رہنما کے طور پر جنسی پاکیزگی کو داغدار کرنے والے ''تمام یہودیوں کو دھوپ میں کھڑا کر کے سولی پر لٹکا دیں تا کہ اسرائیل کو خدا کے غضب سے نجات دلائی جا سکے''۔ قبل اس کے کہ موسیٰ خدا کے حکم کی تعمیل کرتے، نوجوان فینہاس نے خدا کے حکم پر اپنے طور پر کسی رہنمائی کے بغیر عملدرآمد کر ڈالا۔

فینہاس کو خفیہ طور پر معلوم ہوا کہ زمری نامی ایک یہودی موبائٹ خاتون کو اپنے خیمہ میں لے گیا تھا۔ وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے خیمہ کے اندر گھس گیا اور مذہبی جوش میں آ کر اس نے یہ قدم اٹھایا کہ اپنا نیزہ ان دونوں کے جسموں کے آر پار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں خدا نے فوری طور پر طاعون کی وباء کو ختم ہو جانے کا حکم دیا۔ خدا نے موسیٰ کو مطلع کیا ''ربی ہارون کے بیٹے ایلیازار کے بیٹے فینہاس نے اسرائیلیوں کو میرے غضب سے بچا لیا۔ اس نے ایسا کر کے اس جوش اور جذبے کا کھلا اظہار کیا ہے جس سے اسرائیلیوں کو سبق حاصل ہوگا اور وہ جان جائیں گے کہ میں کس طرح انتقام لیتا ہوں''۔ ایک یہودی کو قتل کرنے کے جرم میں سزا پانے کی بجائے خدا نے اسے ''عہد نامہ امن'' سے نوازا۔ اس طرح مستقل امامت کا کام اس کے اور اس کے خاندان کے سپرد کر دیا گیا ''اس لئے کہ وہ اپنے خدا کے احکامات کو بجالانے میں سرگرم تھا''۔

فینہاس کا یہ طبع زاد اور انفرادی اقدام یہودی قوم کے گناہوں کے کفارہ اور خدائی غضب کے اظہار کو ذاتی پارسائی اور ایمانداری کی مثال کے طور پر انجیل میں پیش کیا گیا۔ جب علیجاہ نے خدا کے کنعانی مخالف بعل کے پادریوں کو اس لئے قتل کیا کیونکہ ''وہ خدا کا شیدائی تھا'' اور جب بادشاہ جیہو نے سماریا میں بسنے والے ہر فرد کو قتل کیا تو اس کا یہ عمل بھی ''خدا سے محبت کا عکاس ٹھہرا''۔ پہلی صدی میں زیادہ تر نیک و پاک صاف یہودی ان مذہبی ہیروز کی عظمت کے گیت گاتے تھے اور اپنے اپنے طریقے سے اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن ''پرجوشوں'' کے لئے حمیت اور ولولہ نظریے سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ یہ ان کی مشترکہ شناخت کی علامت تھا اور ان کے لئے مشترکہ اقدام کرنے کا بلاوا بھی۔

''پرجوش'' تحریک کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب روم نے پورے شام اور فلسطین میں مردم شماری کا اعلان کیا۔ رومنوں کا دستور تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ مردوں، ان کی بیویوں، بچوں، غلاموں اور ان کی جائیدادوں کا اندراج اپنے کھاتوں میں کرتے تھے اس کا مقصد جائز ٹیکس عائد کرنا ہوتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ گلیلی کے یہودی قدامت پسندوں کے چھوٹے سے گروہ نے اس کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی گنتی نہیں ہونی چاہیے۔ زمین رومیوں کی نہیں کہ وہ اسے تقسیم کر کے اس پر دوسروں کے ناموں کی تختیاں لگا دیں۔ زمین خدا کی تھی اور صرف خدا ہی اس کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ رومنوں کی طرف سے کی جانے والی مردم شماری کا ساتھ دینے کا واضح مطلب روم کی بادشاہت کو تسلیم کرنا تھا اور یہ مذہب کی بے ادبی تھی، اور ان احکام الٰہی کی خلاف ورزی تھی جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ پر نازل کئے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ سوائے یہوا کے کسی اور کو خدا مت ماننا جو یہودی رومیوں کی طرف سے کی جانے والی مردم شماری کا حصہ بنتا تھا وہ خدا کی بجائے روم کی تابع داری کا مرتکب ہوتا تھا اس لئے وہ یہودی نہیں رہتا تھا۔ وہ مرتد کہلاتا اور اس کی سزا موت تھی۔

شروع شروع میں تو یہ رجعت پسند ایک کرشمہ ساز ربی جس کا نام جوڈاس گلیلین تھا، کے گرد جمع ہوئے جس نے ایک غیر معروف ریا کار ذادوق (یا صادق) نامی شخص کے ساتھ مل کر یہودیت کا ایک نیا فرقہ بنایا جسے پہلی صدی کے مورخ فلیوئیس جوزیفیس نے چوتھے فلسفے کا نام دیا۔ (پہلا فلسفہ فاری سیس کہلاتا تھا جس کے ماننے والے مذہبی قوانین اور تعلیمات پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ دوسرا سادوسیس کہلاتا تھا۔ پہلی صدی کے فلسطین میں یہ فرقہ شاید دوسرے تمام مذہبی سیاسی گروپوں سے واضح طور پر مختلف تھا اس لئے کہ اس فرقے کے لوگ بلا شرکت غیرے خدا کی حکومت پر یقین رکھتے تھے۔ چوتھے فلسفے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا عہد تھا کہ وہ سوائے خدا کے کسی اور حکمران کی خدمت نہیں کریں گے۔ خدا ہی ان کا بادشاہ تھا اور اس کی راج گدی اگرچہ یروشلم میں تھی لیکن وہ پوری دنیا پر محیط تھی۔

یہ مستقبل کی کوئی ایسی بادشاہت نہیں تھی جو دنیا کے اختتام کے وقت قائم کی جانی تھی، مستقبل تو پہلے سے موجود تھا۔ خدا کی بادشاہت تو قائم ہو چکی تھی۔ بس ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس حقیقت کا ادراک کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا جائے جس کے لئے تمام زمینی

حکام کو مسترد کرنا ضروری تھا جیسا کہ عبرانی انجیل میں حکم دیا گیا ہے کہ تمام مشرکین، غیر ملکیوں اور منحرفین کو وعدہ کی گئی زمین سے نکال دیا جائے۔ تباہی کے ذریعے پاک کرنے کا حکم خدا نے اس وقت دیا جب پانچ سو سال قبل اسرائیلیوں نے اس متبرک زمین پر پہلی بار قدم رکھے تھے۔ چنانچہ یہودیوں نے روم کے غلام بننے کے حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو اس وقت انہوں نے خدا کو اپنے حاکم ہونے کا برملا اعلان کر دیا۔ اس لئے کہ جب زمین کو غیر ملکیوں سے صاف کر دیا جائے گا تو تبھی زمین پر خدا کی حکومت حقیقت کی شکل اختیار کرے گی۔ نجات کا راستہ ان کے ہاتھوں میں تھا۔ صرف ایک فیصلہ کرنا تھا کہ خدا کا ساتھ دینا ہے یا روم کا۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں تھا۔

خدا کی حاکمیت کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کے لئے ''چوتھے فلسفے'' کے ارکان اس حد تک سختی سے عمل پیرا ہوئے کہ وہ سکے کو چھوتے تک نہیں تھے جس پر سیزر کی تصویر کندہ تھی۔ وہ ان دروازوں سے نہیں گزرتے تھے جن پر رومن خداؤں کے مجسمے لگے ہوئے تھے۔ وہ کسی ایسے آدمی کو بھی نہیں چھوتے تھے جس کا تعلق ان کے گروہ سے نہیں ہوتا تھا اور اگر انہیں ایسا کرنا پڑ جاتا تو وہ فورا خود کو پاک صاف کر لیتے۔ اگر وہ کسی ایسے یہودی کے سامنے آ جاتے جس کے ختنے نہیں ہوئے ہوتے تھے تو وہ زبردستی اس کے ختنے کرا دیتے۔ اگر وہ کسی یہودی کو خدا کے سوا کسی اور کو رب کہتا سن لیتے تو وہ اسے وہیں پر قتل کر دیتے''۔

اگرچہ یہ واضح نہیں ہے کہ ''چوتھے فلسفے'' والے لوگ خود کو پرجوش کہلاتے تھے یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فلسطین کی پہلی انقلابی تحریک کے داعی تھے جنہوں نے یہودیوں کو ایک مقصد کیلئے اکٹھا کرنے کیلئے ان میں موجود معاشی، سیاسی اور مذہبی رنجشوں کو دور کیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے حمیت اور شوق کے نظریے کو استعمال کیا اور اس کا واحد مقصد تھا خدا کی حاکمیت کا قیام۔ ''حمیت و جوش'' کے ارکان نے ایک معروف نشان دیا جسے تمام یہودیوں نے پسند کیا اور جس کے ذریعے ایک نئی مشترکہ شناخت قائم کی جا سکتی تھی۔ یہ ایسی شناخت تھی جو معبدوں کے حکام کے کنٹرول سے ماورا تھی۔ فلسطین کے تمام دوسرے یہودیوں کے علاوہ اس نئی شناخت کے تحت ''چوتھے فلسفے'' والوں نے روم کے حامیوں کو غدار اور کافر قرار دیدیا، چنانچہ انجیل کے پرجوش، بہادروں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے تشدد کے استعمال کی اجازت دیدی گئی اور تشدد کرنے کی اجازت خدا کے نام پر مانگی گئی اور دی گئی اس لئے کہ یہودیوں کا متبرک فرض تھا کہ وہ اپنی زمین کی

پاکیزگی کو قائم رکھیں۔

اس عقیدے کے ساتھ کہ خدا ان کے اس شوق اور ولولہ کا انہیں انعام دے گا، ہم خیال نہ ہونے کی وجہ سے جوڈاس نے، جس کا لفظی مطلب دوستوں پر تشدد کرنے والا ہے اور اس کے پیروکاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے روم کے خلاف بے احتیاطی اور بدتدبیری کے ساتھ تیار کی گئی مہم بازی کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔ وہ جانتے تھے کہ رومی سلطنت کے خلاف ان کی بغاوت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی لیکن وہ اپنے اس عقیدے سے پیچھے نہیں ہٹے کہ (جوزیفس کے لفظوں میں) ''خدا ان کے اس عمل میں یقینی طور پر ان کی مدد کرے گا۔ بشرطیکہ وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹیں''۔ بہرحال ان کا مسئلہ فتح نہیں تھا، وہ تو محض خدا کی مرضی کی پیروی کر رہے تھے۔

یہ انقلاب جلد ہی اپنی موت مر گیا، لیکن گلیلین کا جوڈاس فراموش نہ ہو سکا۔ پہلی صدی کے اختتام کے وقت فلسطین میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے والے بہت سے کرشمہ ساز انقلابیوں میں جوڈاس ان گنے چنے رہنماؤں میں سے تھا جن کا ذکر انجیل میں ملتا ہے۔ رومی قبضہ کی مخالفت کرنا ایک مذہبی فریضہ تھا اور اسرائیل کی آزادی کیلئے تشدد کا راستہ اختیار کر کے گلیلین کے جوڈاس نے مزاحمت کی مثال قائم کی۔ جس نے بعد کی نسل کو بے حد متاثر کیا اور پھر پرجوش انقلابیوں کے زیادہ پرعزم گروہ پیدا ہوئے جنہوں نے جوڈاس کی بغاوت کی ناکامی سے بہت کچھ سیکھا اور انہوں نے جان لیا کہ اس مقدس زمین کو روم کے چنگل سے نجات دلانے کا راستہ یہ نہیں کہ روم پر براہ راست حملہ کر دیا جائے بلکہ روم کو اس قدر مشتعل کر دیا جائے کہ وہ یہودیوں پر حملہ آور ہوتا کہ اس زمین پر بسنے والے تمام لوگ جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

ہدف بنا کر کی جانے والی ہلاکتوں اور تشدد کے اتفاقی اقدامات نے ''پرجوشوں'' کو پھر ہوشیار اور چوکنا کر دیا تھا (یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے ان کے پیشروؤں نے کیا تھا کہ وہ مشترک سیاسی پلیٹ فارم کی بجائے خدا کی خوشنودی کے حوالے سے متحد ہوئے تھے۔ انہوں نے فلسطین بھر میں خوف و دہشت کی نئی مہم کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے یہودی امراء کو اغوا کر کے تاوان طلب کرنا شروع کر دیا۔ وہ دن دہاڑے رومی کارندوں اور عبادت گاہوں کے پادریوں کو قتل کرتے۔ اس قتل و غارتگری کے لئے ان کے ہاں تہوار اور تعطیلات کے دنوں کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ وہ یہ قتل و غارتگری بازاروں اور عبادت گاہوں میں کرتے اور کوشش کرتے کہ وہ لوگوں کی بھیڑ میں یہ ہولناک کام

انجام دیں۔لگتا تھا کہ ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ جب چاہیں اور جس پر چاہیں حملہ آور ہو سکتے تھے۔وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان سے کوئی بھی شخص محفوظ نہیں۔جوزیفس لکھتا ہے کہ ''انہوں نے جرائم سے پیدا ہونے والے خوف سے کہیں زیادہ موت کا ڈر پیدا کیا۔ویسا ہی ڈر جو جنگ میں ہوتا ہے کہ کوئی بھی کسی بھی وقت لقمہ اجل بن سکتا ہے''۔ان میں سے کچھ نے تو ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر لوگوں کو قتل کر کے یہودیوں کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا صرف اس مقصد کے لئے کہ ان پر واضح ہو جائے کہ روم سے جنگ کرنا ناگزیر ہے اور یہ کہ یہ خدا کا حکم تھا۔

لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے فلسطین کو خوف و دہشت کی آگ میں جھونک دیا تھا، یہ خدا پرست انقلابی، لوگوں میں خصوصاً نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے۔یہ کوئی کسانوں کی بغاوت نہیں تھی۔''پرجوشوں'' اور ان کے ہموطن ساتھیوں کو فلسطین کے تمام حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ان کے رہنما شہری دانشور تھے جو سماجی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ان کی اچھی خاصی تعداد کا تعلق باعزت خاندانوں سے تھا اور کچھ تو ایسے تھے جنہیں معاشرے میں اہم حیثیت حاصل تھی۔یہ کوئی ٹھگ، چور اچکے اور وحشی نہیں تھے بلکہ یہودی معاشرے کے بہترین لوگ تھے جن کی ذہانت کے سبھی قائل تھے۔

یہ انقلابی اس لئے مقبول نہیں ہوئے اور نہ ہی اس لئے ان کی تعریفیں کی گئیں کہ وہ روم کی حکمرانی کی مخالفت کر رہے تھے یہ وہ جذبہ تھا جو پہلی صدی کے فلسطین کے ہر یہودی میں موجود تھا) بلکہ اس کی وجہ معبدوں کے کاہنوں کا مکروفریب تھا جس کے ذریعے وہ یہودیوں کے ذہنوں کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔کاہنوں نے روم کے سامنے سرتسلیم خم کر لیا تھا اور روم کے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دیتے تھے۔''پرجوش'' کے ارکان جب گرفتار ہوتے تو ان پر خوفناک تشدد کیا جاتا لیکن وہ اپنے خدا کی حاکمیت سے انکار پھر بھی نہ کرتے۔معبدوں کے کاہن عشر اور دوسرے ٹیکس وصول کرنے کے پیچیدہ نظام کو چلاتے تھے اور وہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے خود کو دولتمند بناتے رہتے۔''پرجوش'' کے ارکان نے معبدوں کے خزانے پر چھاپا مارا اور ساہوکاروں کے کھاتوں کو تباہ کر دیا اور اس طرح قرضوں کی ادائیگی کو ناممکن بنا دیا۔اس طرح انہوں نے یروشلم کے مالی شعبہ میں مساوات کے عمل کی بنیاد رکھی۔معبدوں کے کاہن اور خصوصاً بڑا کاہن روم سے عہدے خریدتے تھے۔''پرجوشوں'' نے پہلا کام یہ کیا کہ سن ٦٦ء میں روم کے ساتھ جنگ کے بعد

پہلا اعلان جاری کیا جس کے تحت کاہنوں کی پوری اشرافیہ کو معبدوں سے نکال دیا گیا اور قرعہ اندازی کے ذریعے اعلیٰ کاہن کے چناؤ کا رواج قائم کیا۔ (اس کے نتیجے میں افتھیا گاؤں کے ایک شخص سیموئیل کا ان پڑھ کسان بیٹا فنی کاہن اعلیٰ منتخب ہو گیا)۔ اس سے نکتہ یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام یہودیوں کی مذہبی زندگیوں پر معبد کا راج تھا اور معبد کا اختیار تھا کہ وہ یہودیت کے پیغام کو جو معانی چاہے پہنا دے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ ان یہودیوں کی وفاداریوں کو تبدیل نہ کر سکے جن کی شناخت معبدوں کے مخالفوں کے طور پر تھی۔

اس کے باوجود یہ سوچنا صحیح نہیں ہو گا کہ پرجوش تحریک کوئی مذہبی تحریک تھی۔ کاہنوں، راہبوں اور سماجی انقلابیوں کا مختلف لوگوں پر مشتمل یہ گروہ ابتدائی سماجی تحریک کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کی توجہ کا مرکز ایسے اسرائیل کی آزادی تھا جہاں مذہبی شفافیت کا عمل دخل ہو۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی صدی کے فلسطین کے زیادہ تر یہودیوں نے اسی بنیاد پر اپنے سیاسی اور مذہبی جذبات کو استوار کیا۔ پرجوشوں کے ''خدا کی مکمل حاکمیت'' کے نعرے کو، رومی قبضے سے آزادی سے الگ رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ جیسا کہ جوزیفس لکھتا ہے کہ ''انہیں آزادی سے ناقابل تسخیر محبت تھی اس لئے کہ ان کے نزدیک خدا ان کا واحد مالک و حاکم تھا''۔

صدی کے ۶۶ ویں برس میں کہیں جا کر باغی اپنے یہودی رفیقوں کو قائل کر سکے کہ وہ روم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگرچہ یہ انقلاب گلیلین جیوڈاز کے انقلاب سے کچھ زیادہ دیر (۶۹۔۶۶ عیسوی) چلا لیکن آخر کار اسے بے رحمانہ طریقے سے ردِ انقلاب میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس زمانے کے مذہبی رہنماؤں (ربی) کے مطابق یہ جنگ جو ''شیطانی سلطنت'' کے خلاف لڑی گئی، تین سال کے عرصے ہی میں ختم ہو گئی۔

صدی کے ستر ویں (۷۰) سال میں جب رومیوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو انہوں نے معبد کو نہ صرف مسمار کر دیا بلکہ اس کی راکھ کو بھی کیچڑ میں تبدیل کر دیا۔ ہر اُس شخص کو پھانسی دیدی گئی جس کا بغاوت سے کوئی تعلق تھا یہاں تک کہ بچوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ہر عبرانی کو چاہے وہ عیسائی تھا، مقدس شہر سے ہمیشہ کیلئے نکال دیا گیا۔ سرگرم انقلابیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بچ کر صحرا کی طرف فرار ہو گیا اور ایک پہاڑی قلعہ میں جا کر چھپ گیا۔ یہ پہاڑی قلعہ بحیرۂ مردار کے مغرب میں مسادا کے مقام پر واقع تھا۔ یہاں وہ تین برس تک قلعہ بند رہے اور جب آخر کار رومیوں نے

مسادا کی دیواروں کو توڑا تو وہاں انہوں نے ان تمام انقلابیوں کی لاشیں پائیں۔ ان تقریباً ایک ہزار باغیوں نے جن میں شوہر، بیویاں اور بچے بھی شامل تھے، اجتماعی خودکشیاں کر لی تھیں۔ انہوں نے روم کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے ایک دوسرے کو چاقوؤں اور تلواروں سے قتل کیا۔ اس لئے کہ کائناتی جنگجو کبھی اطاعت قبول نہیں کرتے۔

اِن دنوں مسادا سیاحتی مرکز کے طور پر سیاحوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس کی شان و شوکت کی اس خوبصورت علاقے میں کوئی مثال نہیں۔ اس تنہا پہاڑی کی چوٹی سے نمکین پانی والے بحیرۂ مردار سے بھی آگے تک دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر سال اسرائیل کی برّی، فضائی اور بحری فوج کے جوان اپنی فوجی تربیت کے اختتام پر مسادا کے اس قلعہ کی طرف مارچ کرتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دو ہزار سال قبل ایک ہزار عبرانی یہودیوں نے اپنی، اپنی بیویوں اور بچوں کی جانیں لے لی تھیں لیکن اپنی آزادی کا سودا نہ کیا تھا۔ یہاں پر اسرائیلی فوجی یہ عہد کرتے ہیں کہ ''اب مسادا پر کبھی زوال نہیں آئے گا''۔

یہ ایک علامتی تقریب کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اس مقدس زمین پر ماضی اور حال ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ لیکن علامتیں تو بے ثبات اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ان کے معنوں کو آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ مسادا کی چوٹی پر کھڑے اسرائیلی فوجی کے لئے یہ شاندار جگہ بہادری اور فوجی آزادی کی علامت ہو گی لیکن انتہا پسند نظریاتی نو آبادکاروں اور کائناتی جنگجوؤں کی نئی تحریک کے لئے مسادا کا مطلب قطعی طور پر مختلف ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آج کے جدید اسرائیل میں ''سرگرم اور پرجوش'' تحریک کو آدرش کے طور پر دوبارہ زندہ کیا ہے۔

☆☆☆

باب چہارم

معتقدین کی فوج

جس وقت اسرائیلی افواج کا بڑا ربی، جو خود جنگ کا متاثرہ تھا اور جسے میجر جنرل کا اعزاز دیا گیا تھا، یروشلم کے پرانے شہر میں پہنچا تو کسی (شاید وہ کوئی تیز وطرار جونیئر فوجی تھا) نے پہاڑی پر بنے گنبد کی چوٹی پر اسرائیل کا پرچم پہلے ہی نصب کر دیا تھا۔ یہ ۷ جون ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ اس سے دو روز قبل لگتا تھا کہ ابھرتی ہوئی اسرائیلی ریاست کا مستقبل ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ لاکھوں عرب فوجی جن کا تعلق شام، مصر اور اردن سے تھا، اس چھوٹی سی ریاست پر چڑھ دوڑے تھے۔ لیکن اس کے صرف اڑتالیس گھنٹے بعد گورین اپنی بغل میں توریت کا نسخہ دبائے، ہاتھ میں مینڈھے کی سینگ کا بنا ہوا ہارن تھامے پرانے شہر کے وسط میں تیزی کے ساتھ داخل ہوا اور پہاڑی پر بنے معبد کا قبضہ واپس لینے کیلئے آگے بڑھا۔

ابھی جنگ بند نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اردن کے پرعزم فوجی دستے پرانے شہر کے اردگرد کے علاقوں پر قابض تھے۔ وہ مسلسل فائرنگ اور اسرائیلی ٹینکوں پر ناکام حملے کر رہے تھے۔ گولیاں گورین کے سر کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ لیکن کوئی بھی چیز اسے معبد کی طرف بھاگنے سے روک نہیں سکتی تھی حالانکہ اسرائیلی کمانڈر چلاّ چلاّ کر اسے واپس آنے کا حکم دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی چھاتی پر تیز دھار چاقو سے آنیوالے زخم بھی اسے نہ روک سکے۔

اس نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ ''پہاڑی پر بنا معبد ہمارا ہے''۔ اس خیال سے اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگتا تھا۔

ربی گورین ۱۹۲۵ء میں پولینڈ سے ہجرت کر کے فلسطین میں آ بسا تھا۔ اس کا والد مذہبی صیہونیوں کی تحریک کا ایک رہنما تھا جس کا عقیدہ تھا کہ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے فوری بعد مسیحا آئیں گے اور انسانیت کو شفاعت دلائیں گے۔ حیفہ کے قریب ایک قدامت پسند گاؤں کفر حاسدم میں پلا بڑھا تھا۔ وہ غیر طبعی قوت متخلیہ رکھنے والا انسان تھا۔ جب وہ صرف سترہ برس کا تھا تو اس نے عظیم یہودی فلسفی موزز میمونائڈیز پر ایک کتاب ''دی کراؤن آف ہولی نیس'' لکھی۔

میمونائڈیز کا عقیدہ تھا کہ یہودیوں کی ہر نسل کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس معبد کو تعمیر کرنے کیلئے جدوجہد کرے۔ اس لئے کہ یہ معبد خدا کا گھر تھا، زمین اور آسمان کے درمیان ایک واسطہ تھا، دوسرے نوجوان قدامت پرست رہنما، انتہا پسند آبادکار اور قدامت پرست طلبہ جو روایتی قدامت پرستانہ علوم کے حامی تھے، یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودیوں کو صرف اجازت نہیں بلکہ ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ پہاڑی کی چوٹی پر بنے اس معبد میں عبادت کریں۔ ان کے نزدیک اس معبد کی بحالی کافی نہیں تھی۔ بلکہ اس مقصد کیلئے ہر ایک کو جنگ لڑنی چاہیے اور اب وہ ایک قوم کے طور پر موجود تھے جو اس مقصد کی خاطر لڑ رہے تھے۔

پہاڑی پر بنے معبد پر پہنچ کر گورین نے اپنی سانس بحال کی۔ آس پاس کا منظر شاندار تھا۔ کوہِ زیون سے لے کر مغرب تک، مشرق میں اولیوز کا پہاڑ تھا۔ ایک طرف ہیرون تھا۔ اس کے ساتھ جیریکو تھا جس کے بارے میں اللہ نے ان کے آباؤ اجداد سے وعدہ کیا تھا کہ اس تمام علاقے کی زمین ان کی ہوگی۔

گورین نے مینڈھے کے سینگ سے بنے ہارن کو اپنے ہونٹوں میں دبایا، انتہائی متبرک گنبد کی طرف رخ کیا، اپنی بچی کھچی سانسوں کو مجتمع کیا اور اسے بجانا شروع کر دیا۔ کوہ موریاہ پر قدم قدم بڑھتے ہوئے اسرائیلی فوجیوں نے ہارن کی آواز سنی تو وہ بھاگتے ہوئے معبد کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ مجمع نے ربی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ہارن بجاتے ہوئے گورین کو اٹھا کر ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا۔ ہارن بجانے کا مقصد اسرائیلی بچوں کو یہ بتلانا تھا کہ پہاڑی پر بنے معبد کو اسرائیلی قبضے میں لے لیا گیا ہے۔

پھر کسی نے تصویر بنائی۔

وہ تصویر اس وقت میرے سامنے پڑی ہے۔ ربی گورین نے اگرچہ آنکھوں پر موٹے شیشے

کی عینک لگا رکھی تھی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اس کی آنکھوں میں روشنی کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ ہارن کو اپنے ہونٹوں میں دبائے وہ جو شوالگتا ہے جو خدا کے اس غضب کو پکارتا ہے جس سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہارون کی طرح دکھتا ہے جس کی پاکیزہ آنکھیں دودھ اور شہد کی اس زمین پر ٹکی ہوئی ہیں۔ وہ موسیٰ لگتا ہے۔ کس طرح فوجی دھول اور پتھروں کو چیرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ دو ہزار سال تک ویرانوں اور صحراؤں میں بھٹکنے والوں کو آخر کار اسرائیل مل گیا تھا۔ آخر کار انہیں نجات مل گئی تھی، ان کی شفاعت ہوگئی تھی۔

اس روحانی جوش کے لئے گورین کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے جزیرہ نما سینائی، غزہ کی پٹی، مغربی کنارہ، مشرقی یروشلم اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ سارا علاقہ وہ ہے جسے بائبل میں اسرائیل کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بیرونی دشمنوں کا آسانی سے خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ جنگ میں ہونے والی اس کامیابی میں خدا کی مرضی شامل ہونے سے کیا کوئی انکار کر سکتا ہے؟ عرب فوجوں کے ساتھ اسرائیل کی جنگ کو بہت سے یہودی دنیاوی حکومت کا قیام نہیں سمجھتے نہ ہی اسے سیاسی معاملات جانتے ہیں بلکہ اسے کائناتی جنگ قرار دیتے ہیں جو بدی اور اندھیرے کے خلاف لڑی گئی۔ یہودی داؤد نے عرب دیوتا گولائتھ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اور جو پیشن گوئی کی تھی، وہ پوری ہوگئی تھی۔ اب روز قیامت قریب تر تھی۔

سیکولر اسرائیلی تک اس تصور سے جان نہیں چھڑا پائے کہ یہ جنگ خدائی تدبیر تھی۔ معبد پر فوجی غلبہ کے چند گھنٹوں بعد ہی بلڈوزروں نے دیوار گریہ کے سامنے فلسطینیوں کے تعمیر شدہ گھروں کو مسمار کرنا شروع کر دیا اور صدیوں بعد پہلی بار یہودیوں کی اس علاقے میں رسائی ممکن ہو سکی۔ یہودیوں نے چند ماہ کے اندر اندر گورین کے اپنے گاؤں کفر حاسدم اور اس کے قریبی گاؤں کفر ایتزیون کے مغربی کنارے پر اپنے گھر تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ ۱۹۶۷ء کی فتح اور فلسطینی زمینوں پر قبضہ کے ساتھ ہی سیکولر صیہونیت کو، جو کبھی تنگ نظر یہودیوں کے نزدیک قابل نفرت نظریہ تھا، سمجھا جانے لگا کہ یہ خدا کے عظیم تر منصوبے کا وہ مرحلہ تھا جو جلد ہی گزر جائے گا اور اسے داؤد کی بادشاہت کے قیام کا نقیب قرار دیا جانے لگا۔

یہ تصور یا خیال نیا نہیں تھا کہ اسرائیل کی ریاست خدا کی قطعی حاکمیت کی علامت ہے۔ دراصل یہ مذہبی صیہونیت کا عقیدہ تھا۔ یہ تصور ایک ابراہم ٹینر ک ہاکوہن کک (۱۹۳۵۔۱۸۶۵ء)

نامی کرشماتی شخصیت رکھنے والے ربی کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا تھا۔ ربی کک اور اس کے معتقدین اس نوعیت کی ریاست کو خول کا باہری حصہ سمجھتے تھے جو بعد میں مسیحی مستقبل میں بدل جائے گا جس کا واضح مقصد پہاڑی معبد پر مذہبی رسوم کی ادائیگی کی بحالی ہوگا۔

۱۹۲۱ء میں ربی کک نے یروشلم میں ایک ادارہ قائم کیا جس کے ذمہ اس معبد کی تعمیر نو تھی۔ اس نے کہا کہ ''ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ وہ دن آنے والے ہیں جب تمام قومیں تسلیم کرلیں گئی کہ یہ جگہ جسے خدا نے ہمارے معبد کی تعمیر کیلئے چنا تھا، اس کے اصل وارثوں کو وٹا دی جائے گی اور یہ عظیم اور مقدس گھر (معبد) اس جگہ تعمیر ہونا چاہیے''۔

بلاشبہ معبد کی تعمیر نو کا مطلب پہاڑی پر بنے گنبد کی مسماری ہے۔ ربی گورین کے بارے میں ایک کہانی سنائی جاتی ہے جو کچھ یوں ہے ''مینڈھے کے سینگ والے ہارن کو بجانے کے بعد ربی، اسرائیلی دفاعی افواج کے کمانڈر جنرل اورزی نارکس کی طرف بھاگا اور اس پر زور دیا کہ قبل اس کے کہ معاملات طے پا جائیں، سیاستدانوں اور امن چاہنے والوں کی آمد سے پہلے پہلے گنبد کو مسمار کر دیا جائے۔ جنرل نارکس نے گورین کو جھڑک کر چلتا کیا اور معبد کا کنٹرول دوبارہ یروشلم کے مسلمان حکام کے حوالے کر دیا۔ لیکن کٹر مذہبی صیہونیوں کا مسیح کی واپسی کی تیاریوں کے حوالے سے معبد پر قبضہ کرنے کا خواب کبھی ختم نہیں ہوا۔

خدا پرست صیہونیوں کی تحریک کا بنیادی نکتہ وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق یہودی سوئے ہوئے ہیں اور یہ کہ انہیں زبردستی نیند سے بیدار کیا جائے اور انہیں متحرک ہونے کی ترغیب دی جائے۔ پہاڑی والے معبد پر عارضی قبضہ تو انہیں محض بیدار کرنے کی پکار ہے۔ خدا پرست صیہویوں نے دلیل دی کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ خدا کی ڈیزائن کردہ تھی۔ خدا نے عربوں کو مجبور کیا کہ وہ اسرائیل پر حملہ کریں تا کہ وہ جواباً حملہ کریں اور یوں اس مقدس زمین کو آزاد کرائیں۔ ربی کک کے بڑے بیٹے تزی یہودا کک جو انقلابی آبادکاروں کی تحریک گش ایمونم (ایمانداروں کا گروہ) کا رہنما تھا نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ قتل عام بھی ''ایک ظالمانہ مقدس آپریشن تھا تا کہ یہودیوں کو ان کی مرضی کے خلاف اسرائیلی سرزمین پر منتقل کیا جا سکے''۔

اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی آواز پر خدا پرست صیہونی کام پر لگ گئے اور انہوں نے مقبوضہ فلسطینی زمینوں پر آبادیاں قائم کرنا شروع کر دیں۔ آبادیاں قائم کرنے کا عمل اسرائیل کی

سرکاری پالیسی نہیں تھی۔لیکن حکومت اس عمل کو روکنے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔آبادکاروں کے مذہبی عقائد پر ریاست کی حکمرانی ممکن نہیں تھی۔ربی تزوی کک کے ایک عقیدت مندیاً کوف فلمر نے اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسرائیل کی پوری زمین اسرائیلی حکومت کے فیصلے کی قلمرو میں نہیں آتی''۔

تزوی کک ۱۹۸۲ء میں انتقال کرگیا لیکن وہ اپنے پیچھے آبادکاروں کی تحریک کی صورت میں اپنی روح چھوڑ گیا ہے۔گذشتہ تین دہائیوں میں گش ایمونم نے خدا پرست صیہونیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو، جس کا مرکز ربی گورین کا گاؤں کفر ہاسدم میں تھا۔اسرائیل کی سب سے مضبوط سماجی تحریک میں تبدیل کردیا ہے۔سیاسی امور کے ایان لسٹک کے لفظوں میں یہ ایک نیم سرکاری ''تنظیم'' ہے۔لیکن اس کا تنظیمی ڈھانچہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔گش ایمونم برسوں سے شاس، یہادت ہاتورااور نیشنل فرنٹ جیسی رجعت پسند سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے سیاسی پلیٹ فارم کو استعمال کرکے اسرائیلی سیاست پر پوری طرح اثر انداز ہورہی ہے۔ان کا مقصد ریاست کے دیوانی قانون کی جگہ تورات کے مذہبی قانون کو نافذ کرنا ہے۔بہرحال دائیں بازو کی لیکوڈ پارٹی، جو فلسطینی ریاست کے امکان کو رد کرتی ہے اور مقبوضہ علاقوں کو بائبل میں دیئے گئے ناموں سے پکارتی ہے، اب گش ایمونم کے ارکان کو کہتی ہے کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں حکومتی پالیسیوں کے نفاذ میں براہ راست شامل ہوں۔

اپنے پیشرو پرجوشوں کی طرح گش ایمونم اور اس جیسے دوسرے مذہب پرست صیہونی ایک ایسی ریاست پر زور دیتے ہیں جو مکمل طور پر مذہبی قانون کے مطابق چلے۔ایک ایسی ریاست جسے اپنے ''غیر ملکی'' باشندوں سے پاک کردیا جائے تاکہ مسیحا کی واپسی جلد ہوسکے۔گش ایمونم کے مطابق غیر یہودیوں، یہاں تک کہ سیکولر یہودیوں کو بھی اس مقدس اسرائیل میں رہنے کا حق نہیں ہے۔

جیسے پہلی صدی کے فلسطین میں ایک پرجوش کے انفرادی عمل نے پورے علاقے میں مختلف انقلابی گروپوں کو یکجا کردیا تھا، بالکل اسی طرح، فرانسیسی مذہبی سکالر گلز کیپل کی زبان میں ''یہودیت کو دوبارہ نافذ کردینا چاہیئے''۔انقلابی گروپوں کا یہ اتحاد زبان، نسل اور علاقائی سرحدوں سے ماوراء قائم ہوا تھا۔بالکل اسی طرح مذہب پرست صیہونی، کٹر رجعت پرست اور نظریاتی آباد

کار یعنی ایتمر، راحلیم، ریٹز ہر، شلہیوٹ یا، امونا، ہار براچا اور مغربی کنارے پر غیر قانونی طور پر بسنے والے آبادکار اسرائیل کو یہودی ریاست بنانے کیلئے متحد ہو گئے۔ اس تحریک میں شامل ہونے والوں نے اپنے لئے ایک واضح اور علیحدہ مشترکہ شناخت اختیار کی جس پر اسرائیل کی سیکولر حکومت اور اسرائیل کے مذہبی رہنماؤں کا اختیار نہیں چلتا۔ جدید دور کے پرجوش بڑی تندہی سے سیکولر صیہونیت کو جڑ سے اکھاڑنے میں مصروف ہیں جو اسرائیل کے قیام کے وقت سے اسرائیل کی سیاسی شناخت کی بنیاد کو صیہونیت پر رکھنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس کا مقصد سیکولر ریاست کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے۔

غزہ سے اسرائیل کے یکطرفہ انخلاء کے بعد سے اسرائیلی فوجوں کے ساتھ بار بار ہونے والے تصادم میں مذہب پرست صیہونیوں نے واضح کر دیا ہے کہ وہ فلسطینیوں کے ساتھ امن قائم کرنے کی بجائے اسرائیل کے اندر خانہ جنگی کو ترجیح دیں گے۔ یہ اس لئے ہے کہ یہودی، ریاست کے ساتھ وفاداری کی بجائے مذہبی فرض کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسرائیل کی کوئی معنوی قدر نہیں سوائے اس کے کہ وہ یہودیوں کی آبادکاری کا محض ایک وسیلہ ہے۔ ان قومی روایت کا آغاز ڈریفس اور ہرزل سے نہیں بلکہ موسیٰ اور ہارون سے ہوتا ہے۔ ان کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ وہ مقبوضہ علاقوں کو مستقل طور پر اسرائیل کا حصہ بنائیں اور خدا کی وعدہ کردہ زمین کا ایک انچ حصہ بھی فلسطینیوں کو واپس نہ کیا جائے۔ اور جیسا کہ انہوں نے بارہا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ فلسطین کو ریاست بنانے کیلئے ہونے والے مذاکرات کو کسی بھی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دیں گے چاہے اس کے لئے انہیں اپنے ساتھی یہودیوں کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ جن اسرائیلیوں نے ان غیر قانونی آبادیوں پر تنقید کی، ان کے گھروں پر بم برسائے گئے اور یروشلم میں ایسے پمفلٹ تقسیم کیے گئے جن میں امن کی بات کرنے والے اسرائیلیوں کو قتل کرنے والوں کو لاکھوں ڈالر کے انعامات دینے کا اعلان کیا گیا۔ آبادکاروں کے ایک رہنما نے ۲۰۰۸ء میں نیویارک ٹائمز کو بتایا کہ یہودیوں کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ ''کیا وہ توریت کے ساتھ ہیں یا ریاست کے ساتھ''۔

ان انتہا پسند یہودیوں میں سے ایک یہ گل عامر تھا جس نے اسرائیلی وزیراعظم ضحاک روبن کو اوسلو امن معاہدہ پر دستخط کرنے کے ''جرم'' میں قتل کر دیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت

اسرائیل کو وہ علاقے فلسطینیوں کو واپس کرنے تھے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ علاقے میں مستقل امن کے قیام کی طرف پہلا قدم تھا۔لیکن عامر کے اس عمل نے امن کے عمل کو پٹڑی سے اتار دیا اور یوں اوسلو معاہدہ ختم ہو گیا اور یہی عامر کا مقصد بھی تھا۔اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایسا بھیانک جرم کیوں اور کس کے کہنے پر کیا تو ییگل عامر نے جواب میں کہا کہ اس نے اکیلے ہی یہ کام کیا اور کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ خدا کی رضا حاصل کرنے کیلئے کیا اور اس طرح اس نے فیہاس کی تقلید کی۔اس نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ یہودی قانون اور فتوے کے عین مطابق تھا۔''حلاچہ (یہودی قانون) کے مطابق آپ دشمن کو قتل کر سکتے ہیں''۔اس نے مقدمے کی سماعت کے دوران مجسٹریٹ کو بتایا کہ ''میں نے اپنی ساری زندگی حلاچہ کے بارے میں جاننے میں گزاری۔ جب آپ جنگ میں قتل کرتے ہیں تو اس عمل کی اجازت ہے''۔واقعی یہ بہت ہی آسان بات تھی۔رابن امن کی خاطر خدا کی زمین دوسروں کو دے رہا تھا۔اس طرح اس نے اپنے یہودی ہونے کی شناخت کھو دی۔اب وہ ''دشمن'' تھا،ایک غدار، ایک منحرف تھا۔اس کا گناہ اس پوری زمین کو تباہ کر دینے والے کیڑے کا تھا اس لئے اس کو ختم کر دینا ضروری تھا۔عامر کا عقیدہ تھا کہ رابن کو قتل کر کے وہ اسرائیل کو خدا کے عذاب سے بچا رہا تھا۔ بقول اس کی بیوی کے وہ خدا کے لوگوں کیلئے قربانی دے رہا تھا۔

ییگل عامر کو سر پھرا (پرجوش)،انتہا پسند،دہشت گرد اور پاگل تک کہا گیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ انجیل میں جس اسرائیل کا ذکر ہے،اس کے تقدس اور واجب احترام ہونے کے حوالے سے اس کے خیالات اور مقدس سرزمین کی کلیّت کو پاک صاف کرنے اور اس کے تحفظ کیلئے کئے جانے والے اقدامات کو حیران کن طور پر آج کے جدید اسرائیل میں بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔۲۰۰۶ء میں اسرائیلی اخبار ''یے ویوتھ ہارونوتھ'' کے لئے دہاف انسٹیٹیوٹ نے جو پول کیا، اس کے مطابق ایک تہائی اسرائیلیوں نے عامر کو رابن کے قتل میں معاف کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔خود کو ''مذہب پرست'' اسرائیلی کہلانے والوں میں سے ۵۰ فیصد نے عامر کو رہا کرنے کی حمایت کی۔۲۰۰۷ء میں رابن کے قتل کی تیسویں برسی کے موقع پر حیفہ میں کچھا کھچ بھرے ہوئے فٹ بال سٹیڈیم میں اس وقت اچانک ''ییگل عامر! ییگلِ عامر!'' کے نعرے لگنے لگے جب کہ اناؤنسر سابق وزیراعظم کی یاد میں ایک لمحہ کی خاموشی کی اپیل کر رہا تھا۔

صرف اسرائیل ہی میں عامر اور کائناتی جنگ میں حصہ لینے والے اس کے ساتھیوں کو حمایت حاصل نہیں بلکہ یہ حمایت تو ہر اس جگہ ہے جہاں اس نکتہ نظر سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی آباد ہیں۔ جب امریکہ کے بڑے عیسائی پادری پیٹ رابرٹسن نے رابن کے قتل کی خبر سنی تو اس نے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ واقعہ علاقے کیلئے خدا کے ماسٹر پلان کا حصہ تھا۔ رابرٹسن نے اعلان کیا کہ ''یہ خدا کی زمین ہے اور خدا ایسے شخص کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتا ہے جو خدا کی زمین کے حصے بخرے کرے۔ جب رابن نے مقدس زمین کے حصے بخرے کرنے شروع کئے تو ربیوں نے اس پر لعنت بھیجی تھی''۔

رابرٹسن محض ایک مذہبی میڈیا مین نہیں تھا۔ وہ ان رجعت پرست مذہبی تنظیموں کے اتحاد کا اہم ترین شخص تھا جس میں زیادہ تر تنظیمیں امریکہ میں قائم تھیں اور جو پوری اسرائیلی سرزمین پر قبضہ کرنے کیلئے کائناتی جنگجوؤں کی ہر ممکن طریقے سے مدد کرتی تھیں۔ یہ نام نہاد صیہونی (یہ اصطلاح تھیوڈور ہرزل نے ان عیسائی نوآبادکاروں کیلئے استعمال کی تھی جو اسرائیلی ریاست کے قیام کے حامی تھے) اس عقیدے سے تحریک لیتے تھے کہ اسرائیل کی سیاست اور اس سے بھی بڑھ کر پورے مشرق وسطیٰ کی سیاست کا نقشہ خود خدا نے تیار کیا ہے۔ اور اسرائیل اور فلسطین میں یہودیوں اور ان کے مدمقابل مسلمانوں کی طرح یہ امن کے عمل کے خلاف کام کرنے میں بڑے متحرک تھے جس کے حوالے سے وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ یہ ایک ایسی عالمی سازش تھی جس کا مقصد یروشلم کو یہودیوں سے چھیننا تھا۔ ایک مصنف مائیک ایوانز کے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سازش کا سرغنہ شیطان تھا جو اس کھیل کی ہدایات دے رہا تھا۔ جیسا کہ امریکہ کے سب سے بڑے چرچ کے پاسٹر جوہن ہیگ جو کرسچین صیہونیت سب سے بڑا پادری تھا، نے بڑے فخر نے اعلان کیا تھا کہ ''خدا کو اس کی پرواہ نہیں کہ اقوام متحدہ کیا سوچتی ہے۔ اس (خدا) نے اسرائیلی قوم کو یروشلم دیا اور اب یہ ان کا ہے''۔

اسرائیل کے یہودی کائناتی جنگجوؤں کی طرح ان مسیحی کائناتی جنگجوؤں کا عقیدہ تھا کہ مسیح کی واپسی کو یقینی بنانے کیلئے ضروری ہے کہ یہودی یروشلم میں معبد تعمیر کریں۔ مسیحی ہونے کے ناطے ان کا عقیدہ تھا کہ مسیحا حضرت عیسیٰ ہیں اور یہ کہ جب وہ زمین پر واپس آئیں گے تو پھر یہودیوں کو یا تو مسیحیت کی طرف واپس لوٹنا ہوگا یا پھر وہ جہنم میں جائیں گے۔ لیکن عجیب بات یہ

ہے کہ مسیحا کو ماننے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے اتحاد کے باوجود اس کائناتی ڈرامے کا آخری ایکٹ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو ایک شناخت اس لئے مل سکتی ہے کہ ان کی قدرِ مشترک کائناتی تصور ہے اور اس سے بڑھ کر ان کے اتحاد کی وجہ ان کا مشترکہ کائناتی دشمن ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ کی کرسچئین الائز کاکس کے ڈائریکٹر جوش رینٹین کا کہنا ہے کہ ''سیاست اور مذہب کے درمیان موجود لکیر مٹ رہی ہے''۔ اس کاکس کا مقصد اسرائیل کے صیہونیوں اور امریکہ کے رجعت پرست عیسائیوں کے درمیان روائتی تعلق قائم کرنا ہے۔ جوش کہتا ہے کہ ''پوری دنیا میں یہودی اور مسیحی اقدار کے خلاف انتہا پسند اسلام روبہ عروج ہے اور ہمیں پوری طرح منظم ہو کر اس کا مقابلہ کرنا ہوگا''۔ دی لیٹ گریٹ پلانیٹ ارتھ (The Late Greate Planet Earth) کے مصنف لال لنڈ سے نے لکھا ہے کہ ''اسلام ایک کائناتی دشمن ہے جو نہ صرف اسرائیل کو ختم کرنا چاہتا ہے بلکہ مغربی ثقافت کی بنیاد، یہودی و عیسائی ثقافت ہی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے''۔ لنڈ سے اور اس کے عیسائی کائناتی جنگجو پیروکاروں کے لئے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تنازعہ سیاسی مسئلہ نہیں جسے سفارتی سطح پر حل کر دیا جائے بلکہ یہ تو دنیا کے اختتام پر دنیا کے دوبارہ آغاز کا معاملہ ہے۔ ان کے تصورات میں اچھائی اور بدی کی فوجیں پہلے ہی سرزمین مقدس پر آخری جنگ کے لئے صف آرا ہو رہی ہیں۔ جب ان ڈھلوانی وادیوں اور زیتون کے درختوں سے بھری اس وادی میں جنگی مشینوں کی بھرمار ہو جائے گی تو پھر یہ دنیا انسانی خون سے سرخ اور لاشوں سے اٹ جائے گی۔

یہ عیسائی صیہونی یقین کرتے ہیں کہ زمین پر آخری اور فیصلہ کن جنگ یروشلم پر لڑی جائے گی۔ ۱۱ ستمبر کے حملوں اور ان کے نتیجے میں دہشت گردی کے خلاف شروع ہونے والی جنگ، ان کے خیال کے مطابق، تصادم کے تھیٹر کا پھیلاؤ ہے اور کائناتی جنگ کا مرکز اس جگہ منتقل ہو گیا ہے جسے وہ ''خدا کا نیا اسرائیل'' (یعنی امریکہ) کہتے ہیں۔ امریکہ کے باسی تو پہلے ہی تقدیرِ الٰہی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس غیر مانوس سرزمین پر آباد ہونے والے پیوری ٹنز Pruritans تو اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں کہ وہ ''نئی دنیا میں آباد'' ہونے کی کہانی کے کردار ہیں''۔

''ہم امریکی، خدا کے خاص اور اس کے چنے ہوئے لوگ ہیں''۔ ہرمن میلول نے لکھا۔ اٹھارہویں صدی کے شعلہ بیان مذہبی رہنما جوناتھن ایڈورڈز امریکہ میں موجود اسرائیلی ریاست

کے حامیوں کو ''ناراض خدا کے ہاتھ میں گناہ گار'' قرار دیتے ہوئے امریکہ کو ''نیا کنعان'' قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ امریکہ پرانے براعظم کے سچے مذہب کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بانیوں نے سوچ سمجھ کر امریکہ کو ''پوٹومیک پر اسرائیل''، ''قوموں کے لئے روشنی'' پہاڑی پر شہر کے طور پر قائم کیا تھا۔ جب اس نئی قوم کی نمائندگی کی خاطر مہر کا خاکہ تیار کرنے کو کہا گیا تو بنجمن فرینکلن، تھامس جیفرسن اور جان ایڈمز نے جو خاکہ تیار کیا اس پر سرکنڈوں کے سمندر کے ساحلوں پر گھڑ سوار موسیٰ، کا جو خاکہ کندہ کیا گیا اس میں موسیٰ کے ہاتھ میں بلند ہوتی ہوئی لاٹھی اور فرعون کی فوج پر سمندری پانی کی بپھرتی ہوئی موجیں چڑھتی دکھائی گئی ہیں۔ اس پر کندہ ماٹو ہے ''ظالموں کے خلاف بغاوت خدا کی تابعداری''۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ ''کرسچین قوم'' کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ ایک جدید تصور یا خیال تھا جس کی بنیاد فرانسیسی پروٹسٹنٹ جان کیلون کی تاریخ پر ان کے ناقابل اعتبار نکتہ نظر پر مذہبی سکالر روٴساز جان رشدنی کی توجیہات پر رکھی گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں رشدونی کی کتاب ''امریکی تعلیم کا مسیحائی کردار اور انٹیلکچول شیزوفرینیا'' کو کرسچین نیشنل موومنٹ نے دوبارہ شائع کر کے اس کی رونمائی کرائی۔ ادارتی چرچ کے جوئے کو گردن سے اتار پھینکنے کے بعد اس نئی قوم نے اپنے آپ کو ایک اور قسم کے چرچ کی غلامی میں دے دیا۔ حب الوطنی نے مذہبی پرستش یا ریاضت کی شکل اختیار کر لی۔ پرچم کو ایک ایسے جانور کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اعلان آزادی خدا اور اس کے نئے منتخب لوگوں کے درمیان اقرار نامہ کے طور پر تیار کیا گیا۔ آئین کو کتاب مقدس کی حیثیت دے دی گئی۔

واضح منزل سے دہشت گردی کے خلاف جنگ تک امریکی تجربے کو ہمیشہ مقدس مقصد کے احساس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ جس کے مطابق امریکی اقدار کو خدا کی اقدار قرار دے دیا گیا ہے جن پر عمل درآمد پوری دنیا پر لازم ہے۔ جن اصولوں پر ملک قائم کیا گیا ہے اگرچہ وہ عالمی نہیں بلکہ دلیل سے مستغنی ہیں جو خدا نے تمام انسانوں کے لئے طے کئے ہیں لیکن فی الحال صرف ایک ملک میں ان پر عمل درآمد ہو رہا ہے تو پھر یہ اس قوم کا فرض ہے کہ وہ یہ تمام اصول دوسری قوموں تک پہنچائیں اور اس طرح زمین پر خدا کے حکم کی تعمیل کرائی جائے چاہے اس کیلئے طاقت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ امریکہ کے انیسویں صدی کے وزیر لے مین بیچر نے اپنی تبلیغی

تقریر میں کہا کہ ''امریکہ کا عزم ہے کہ وہ دنیا کی اخلاقی اور سیاسی مکتی کیلئے دنیا کی رہنمائی کرے''۔

امریکہ کی یہ ''مقدس دور اندیشی'' صرف عیسائیوں کے جذبات کا اظہار نہیں ہے۔ جوں جوں دنیا بھر کے ملکوں سے تمام عقیدوں اور مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگ جوق در جوق اس نئی دنیا میں آتے گئے وہ آہستہ آہستہ اس ثقافتی رنگارنگی میں رنگتے چلے گئے اور اس مہم کا حصہ بن گئے جس کا مقصد باقی دنیا کو سیاسی اور اخلاقی بلوغت سے ہمکنار کرنا اور انسانوں کی فلاح ہے۔

امریکہ کے مقدس مقصد اور قومی دیانتداری کے تصور کا حاصل یا نتیجہ واضح ہے۔ اگر امریکہ خدا کا ایجنٹ ہے تو پھر امریکہ کے دشمن، چاہے وہ اندرونی ہوں یا بیرونی، شیطان کے ہی ایجنٹ ہوں گے۔ اس کائناتی دوئی نے امریکی سیاستدانوں کو، خصوصاً تصادم اور جنگ کے دنوں میں، بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران پبلک انفارمیشن کے لئے قائم کردہ کمیٹی کو امریکی حکومت نے فرض سونپا کہ وہ امریکیوں کو قائل کرے کہ ولیوں اور بزرگوں نے بہت بڑی بدی کے خلاف جنگ شروع کی ہے اور یہ کہ ''ہُن'' کمیٹی کے نزدیک اس کا مطلب جرمنی کے لوگ تھے، جو شیطان کے تخلیق کردہ لوگ ہیں جن کے ہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں اور جن کا مقصد آزاد دنیا کو تباہ کرنا ہے۔'' دوسری جنگ عظیم میں بھی اسی قسم کے خیالات کا پروپیگنڈہ کیا گیا جسے فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ نے اچھائی اور بدی کی کائناتی قوتوں کے درمیان جنگ کے طور پر پیش کیا۔ روز ویلٹ نے ٦ جنوری ١٩٤٢ء کو کانگریس میں اعلان کیا کہ ''یہ دنیا ہٹلر اور خدا دونوں کے ساتھ ساتھ رہنے کیلئے بہت کم ہے''۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ شروع ہوگئی جو پچاس برس تک جاری رہی۔ سرد جنگ نے اس کائناتی دوئی کو بڑے موثر طریقے سے ایک نظریاتی بنیاد میں تبدیل کر دیا۔ اب تصادم خدا اور شیطان کے درمیان زیادہ نہیں تھا بلکہ یہ تصادم خدا اور کفر والحاد کے درمیان تھا۔ جب رونالڈ ریگن نے جو ہال لنڈسے، جیری فالویل اور مائیک ایونز جیسے مذہبی نظریہ سازوں کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں باقاعدگی سے ملاقاتیں کرتا اور وہ ان سے کتاب مقدس (انجیل) اور پیشن گوئیوں کے بارے میں درس لیتا تھا، سب سے پہلے سوویت یونین پر الحادی ہونے کا لیبل لگایا۔ ایونجی کلز کی نیشنل ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اس نے سوویت یونین کو ''بدی کی سلطنت'' قرار دیا۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظ استعمال کئے لیکن اس کی تقریر کے عیسائی سامعین اس کے اشاروں

کنایوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ ریگن نے سوویت یونین کے کسی خاص اقدام کو بدی نہیں کہا بلکہ اس کے نزدیک یہ بدی مافوق الفطرت قوت تھی جس کا کوئی نام نہیں تھا، جو بنیادی تھی اور جو حاضر و ناظر تھی۔ یہ اچھائی کے الٹ تھی۔ ''ہمارے'' الٹ تھی۔

جنگ کی حمایت میں مبالغہ آمیز مسیحی فن خطابت کا ایسا بے حیائی والا استعمال، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، صلیبی جنگوں کی میراث ہے جو نہ صرف اس تصور کو تقویت دیتا ہے کہ ''مسیح کے دشمنوں'' کے خلاف جسمانی جنگ عیسائیوں کے عقیدے کا صحیح اظہار ہو سکتا تھا لیکن اس سے عیسائیت کی حقیقی زبان ہی بدل گئی۔ جنگ کے میدان میں پادریوں، راہبوں، بڑے پادریوں، خود پوپ (لیو نہم) کے علاوہ مذہبی فوجی اداروں کے اراکین، بیت المقدس کے زائرین کی حفاظت کرنے والوں اور معالجین کی موجودگی عیسائیت میں جنگ اور عسکریت پسندی کے مذہبی استعارے ہیں جن کا آج بھی دنیا بھر کے کلیساؤں میں اظہار نظر آتا ہے۔ ان کلیساؤں میں لوگوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ ''خدا کی طرف سے دی گئی زرہ بکتر'' پہنیں اور ''جنگ میں مسیح کا جھنڈا'' لے کر چلیں۔ ان کلیساؤں میں ہونے والی تقریبات اور کارروائیاں عسکریت پسندی کا واضح اظہار ہوتی ہیں۔

امریکہ کے سب سے بڑے اور سیاسی طور پر بااثر ایونجیکل چرچ کے، جو کولوراڈو سپرنگز میں نیو لائف چرچ کے نام سے موسوم ہے، سابق پاسٹر ٹیڈ ہیگرڈ کا کہنا ہے کہ ''عیسائیوں کا قیام تو جنگ کے مستقل طور پر جاری رہنے میں ہوتا ہے''۔

آنجہانی جیری فال ویل، جو امریکہ میں ''مذہبی حق'' کے عروج کا ذمہ دار تھا، نے اعلان کیا تھا کہ ''مقامی چرچ ایک منظم فوج ہے جو جنگ کے لئے ہمیشہ رہتی ہے، اپنے دشمن پر حملہ کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے''۔ اس نے مزید کہا کہ ''دی سنڈے سکول حملہ کرنے والا سکواڈ ہے اور مسیح مشنری کا فرض ہے کہ ''وہ ہمارے علاقے پر بمباری کرے تا کہ ہم اپنے خول سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ آور ہوں، دشمن کے مضبوط مراکز پر چڑھ دوڑیں''۔

یہ محض استعارے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسرائیل کی ڈیفنس فورس اپنے فوجی ایجنڈے کو پورا کرنے کے لئے مذہبی علامات کا استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ ریلیجس رائٹ اپنے سماجی ایجنڈے کی بڑھوتری کیلئے جنگ اور عسکری علامات استعمال کرتی ہے۔ صدیوں سے شعلہ بیان مبلغین مسیحی عقیدے کے بارے میں یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس کا مطلب اس دنیا کی

شیطانی قوتوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔

اس کے باوجود یہ نوٹس نہ کرنا مشکل ہے کہ گذشتہ صدی کے دوران اس قسم کی عسکریانہ مذہبی خطابت ایسی امریکی مذہبی تحریک کا جزو کیسے بن گئی جس کی نمائندگی ہیگرڈ، فال ویل اور ریٹ رابرٹسن کرتے ہیں۔ بلاشبہ ہم عصر امریکی عیسائی مبلغین اس تصور کے سحر میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جنگ ہی عیسائیت کا صحیح اظہار ہوسکتی ہے۔ امریکی عیسائیت کے سکالر جارج مارسڈن کی تحقیق کے مطابق ایونجیکل افراد (حضرت عیسیٰ کے عقیدت مند) دوسرے امریکیوں کی نسبت جنگ کے زیادہ حامی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے حوالے سے ایسا ہی ہوا۔ ۲۰۰۴ء میں یونیورسٹی آف واشنگٹن کے جیمز کے ویلمین نے پیفک نارتھ ویسٹ میں تیزی کے ساتھ قائم ہونیوالے چوبیس چرچوں کا جو سروے کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عراق پر امریکی حملوں کو بہت زیادہ حمایت حاصل ہے۔ ویلمین نے تقریباً تین سو ایونجیکل پادریوں اور دوسرے رہنماؤں کو انٹرویو کیا تو ان میں سے صرف پندرہ ایسے تھے جو جنگ کی غیر مشروط حمایت نہ کر سکے۔ دو سال بعد امریکی معاشرے کے ہر طبقے میں جنگ کی حمایت بے حد کم ہو چکی تھی۔ یہ انکشاف ایک اور سروے سے ہوا جو بیلر یونیورسٹی نے کرایا تھا۔ اس سروے کے مطابق امریکہ میں ساٹھ فیصد ایونجیکلز عراق میں جنگ کے حامی تھے (پچاس فیصد ایسے تھے جنہیں یقین تھا کہ ۹ نومبر کے حملوں میں صدام حسین کا براہ راست کردار تھا)۔

ایسا نہیں ہے کہ ایوانجیکلز عمومی طور پر جنگ کے حامی ہیں۔ تاہم ایونجیکلز کا نکتہ نظر مسیح کی معاف کرنے اور عدم تشدد کی روایتی تعلیم کے برخلاف ہے۔ اس نکتہ نظر کے مطابق تصادم کو کائناتی لینس کے ذریعے سے دیکھا جائے تو جنگ ضروری ہے (''بدی کی سلطنت'' کے حوالے سے رونالڈ ریگن اور جارج بش کے ''بدی کا محور'' نے کس طرح ایونجیکلز کے ذہنوں کو اپنے تسلط میں لے لیا تھا)۔ اس کو جاننے کیلئے ایونجیکل مذہبی تحریک کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایونجیکلزم مذہبی فرقے سے زیادہ سماجی تحریک ہے جس کی توجہ کا مرکز وہ ہے جسے وہ انجیل کی کہانی کے سماجی نتائج قرار دیتے ہیں۔ مختصراً یہ مختلف اور بالکل انفرادی سطح کی معمولی تحریکوں کا اختلاط ہے جو اپنی مذہبی بنیادوں کو عیسائیت کے احیاء کے رجحانات پر استوار کرتے ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے دوران برطانیہ اور امریکہ میں ان احیائی رجحانات پر پروٹسٹنٹ کلیساؤں کا غلبہ رہا ہے۔

عیسائیت میں ایونجیکلز کو علیحدہ مذہب سمجھنا صحیح نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ عالمی سطح کی تحریک ہے جو پروٹسٹنٹ روایات۔میتھوڈسٹ سے لے کر پریسی بیٹرین اور جنوب کے بپٹسٹوں سے کرپنٹی کوسٹلز تک سے تقویت حاصل کرتی ہے۔

امریکہ کی جدید ایونجیکلزم نے امریکہ کی ایک اور مضبوط مذہبی تنظیم فنڈامینٹلزم (بنیاد پرست) سے جنم لیا جس کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا تھا۔ یہ کنزرویٹیو عیسائیوں کے لئے بہت زیادہ بے یقینی کا دور تھا۔ ڈاروِنزم اور فیمینزم (حقوق نسواں) جیسے نئے اور غیر مانوس تصورات روائتی مسیحی عقیدوں کے لئے غیر معمولی چیلنج بن گئے تھے۔ سائنسی انقلاب نے عمومی طور پر کائنات کی تخلیق کے حوالے سے مذہبی نکتہ نظر کو مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔ ادبی تنقید کے نئے نئے نظریات نے مذہبی سکالروں کی نئی نسل کو نئی راہیں سجھائیں اور انہوں نے انجیل کو نئے خیالات کے حوالے سے جانچنا شروع کر دیا۔ ان کی ان کوششوں کا نتیجہ کرسچین لبریشن کی تحریک کی صورت میں نکلا جس کا مقصد روائتی مسیحی اقدار کو سائنسی ترقی، ثقافتی ہم آہنگی اور مذہبی کثرتِ وجود کے امریکی نصب العین کے ساتھ جوڑنا تھا اور وہ بھی اس وقت جب تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی جدیدیت اور معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے سیکولرازم کی وجہ سے کلیساؤں کی حاضری میں بہت زیادہ کمی ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں کیتھولک اور یہودیوں کی امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باعث امریکہ کے مذہبی تشخص کو زبردست دھچکا لگا۔

بنیاد پرستی (فنڈامینٹلزم کی اصطلاح کرسچین رسالوں ''دی فنڈامینٹلز'' جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۵ء کے درمیان شائع ہوئے) کا مطلب امریکی معاشرے میں اِن نئی قوتوں کو شکست دینا تھا۔ بنیادی طور پر ''بنیاد پرستی'' کی اصطلاح کو امریکی ایونجیکل تحریک کے عسکری بازو کو استعمال کیلئے اختیار کیا گیا۔ (جارج مرسڈین نے لکھا ہے کہ بنیاد پرست وہ ایونجیکل ہوتا ہے جو کسی چیز کے حوالے سے ناراض ہو) بنیاد پرست دلیل دیتے ہیں کہ محض خدا پر یقین رکھنا اور کتاب مقدس کی تعلیمات پر عمل کرنا کافی نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذاتی سطح پر حضرت عیسیٰ سے عہد کرے اور اپنی غلطیوں کو نہ دہرانے کا وعدہ کرے تاکہ اس کے گناہ معاف ہوسکیں اور اس کے گناہوں کی تلافی ہو سکے۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان پاکیزگی اور معصومیت کے ساتھ دنیا میں دوبارہ داخل ہو سکے گا۔

بنیاد پرست رہنما عیسائی عقیدے کے بنیاد پرستوں کی اصلی شکل میں واپسی کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم انجیل کی قطعی، معصومیت پر مبنی اور مکمل لغوی طور پر تقلید تھی۔ بنیاد پرستوں کے نزدیک انجیل تاریخی طور پر ایسی حکایت اور روایت تھی جو دنیا کی تخلیق سے لے کر اس کے اختتام تک قائم رہے گی اور جس کا ہر لفظ خدا کا دیا گیا لفظ ہے۔ دوسرے لفظوں میں انجیل میں نہ صرف یہ کہ کوئی سہو یا غلطی نہیں ہے بلکہ اس کی داستانوں اور کہانیوں کو تاریخی حقیقت کے طور پر پڑھنا ضروری ہے۔

یہ بنیاد پرستانہ صورت دراصل روائتی مسیحیت سے کنارہ کشی تھی۔ اگرچہ پہلے زمانے کے عیسائی سمجھتے تھے کہ انجیل کو تخلیقی ذہانت رکھنے والے انسانوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا گیا۔ جس کے ذریعے خدا کے کہے ہوئے احکامات منکشف ہوئے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ لفظ انسانوں کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خوشخبری دینے والے چار افراد کو ولیوں کا درجہ دیا۔ حالانکہ یہ چاروں حضرت عیسیٰ کے حسب نسب، ان کی پیدائش کے واقعات، ان کی زندگی کے حالات، ان کی وفات کی تاریخ اور وقت اور اُن کی دوبارہ زندگی کے حوالے سے ایک دوسرے سے متضاد باتیں کرتے رہے۔ ان غلطیوں کو چھپانے یا ان پر معافی مانگنے کی بجائے پہلے زمانے کے عیسائی کھلے عام تسلیم کرتے تھے کہ وہ اس جاری مکالمے کا حصہ تھے جس کا مقصد حضرت عیسیٰ کے لفظوں اور ان کے اعمال کے معانی اور ان کی اہمیت کو سمجھنا اور جاننا تھا۔

بہرحال بنیاد پرستوں کے نزدیک انجیل کی لفظی ماہیت محض عقیدہ نہیں تھا بلکہ یہ مسیحیت کے ساتھ وفاداری کا امتحان تھا جس کے ذریعے وہ خود کو دوسرے عیسائیوں سے مختلف سمجھتے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں بنیاد پرست مبلّغوں نے کرسچین تقلید پسندی پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کیلئے اپنے جتھوں کو مجتمع کرنا شروع کر دیا تاکہ وسیع ایونجیکل اتحاد سے علیحدہ ہو کر امریکی معاشرے میں بڑھتے ہوئے لبرل ازم اور سیکولرازم کا راستہ روکا جا سکے۔ بنیاد پرست گروپوں نے اپنے چرچ قائم کرنے شروع کر دیئے۔ ابتداء میں یہ چرچ گھروں اور سکولوں میں قائم کئے گئے۔ اپنے مقصد کے حصول اور کرسچین لبرل ازم کا مقابلہ کرنے کیلئے انہوں نے رضا کار تنظیمیں قائم کیں جن کا مشن ملک بھر میں اپنے عقیدوں کو پھیلانا تھا۔ لیکن چھٹی دہائی میں مبلّغ بلی گراہم کی جدوجہد کے نتیجے میں امریکہ میں ''بنیاد پرست'' جیسی اصطلاح کا زور ٹوٹنے لگا بہرحال

بنیاد پرستی بذات خود ختم نہ ہوئی۔ اس کے بجائے اس کا سخت گیر سماجی نظریہ اور عسکری سوچ دوبارہ اصلی ایونجیکلزم کا حصہ بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی ایونجیکل اختلاط میں اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں دو قطعی مختلف تحریکیں وجود میں آ گئیں۔ ان میں سے ایک تحریک سماجی اور مذہبی حوالے سے نرم رویہ رکھتی تھی اس تحریک کی نمائندگی نیشنل ایسوسی ایشن آف ایونجیکلز اور جم ویلس کی سماجی انصاف کی تنظیم ''سوجورنرز'' جیسے گروپ کرتے تھے۔ دوسری طرف نظریاتی طور پر شدت پسند اور سماجی طور پر رجعت پرست، جن کی نمائندگی پیٹ رابرٹسن کی کرسچین کولیشن اور جیمز ڈوبسن کی فوکس آن دی فیملی جیسے گروپ کرتے تھے (مذہبی سکالروں کا تعلق سابقہ تحریک ایونجیکلزم سے تھا جبکہ دوسرے گروپ کا تعلق بنیاد پرست ایونجیکلز سے تھا)

اس سے ثابت ہوا کہ اصطلاح ''ایوانجیکل'' خود ساختہ ہے۔ گیلپ اور پرنسٹن ریلیجن ریسرچ سنٹر نے رائے عامہ کے لئے جو سروے کروائے ان کے کے مطابق امریکیوں کی ایک تہائی تعداد خود کو ایونجیکل کہلانا پسند کرتی ہے۔ تاہم کچھ مشترکہ خصوصیات ایسی ہیں جو مختلف النسل عیسائیوں کو مشترکہ شناخت کے ساتھ متحد رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو بنیادی عقیدوں پر مکمل یقین رکھنا ہے جس کے تحت انجیل کو ماننا حضرت عیسیٰ کی غیر مشروط اطاعت دوسروں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنا اور کائناتی تناظر کو جاننا لازمی ہے۔ جارج مرسڈین کہتا ہے کہ ''جہان (دنیا) دو حصوں میں منقسم ہے۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی، روشنی اور اندھیرے کی طاقتیں''۔ اگرچہ ایسے اعتقادات کسی نہ کسی شکل میں عیسائی دنیا میں موجود ہیں لیکن ایونجیکل تحریک کو جو بات جدا کرتی ہے وہ یہ ہے عقیدہ کہ ان اعتقادات پر ایمان لاتے ہوئے ان پر مکمل طور پر سختی سے عمل پیرا ہونا۔ اس کے نتیجے میں انسان کی روحانی سطح پر دوبارہ پیدائش ہوتی ہے اور یہی وہ بات ہے جو ایونجیکلز کو باقی عیسائیوں سے مختلف کرتی ہے (چنانچہ ایونجیکل عقیدہ یہ ہے کہ مکتی ان کے لئے ہے جو ''دوبارہ پیدا'' ہوتے ہیں)۔

تاہم اِن اعتقادات پر یقین رکھنے کے علاوہ ایک خاص عقیدے کے لوگ جو ایونجیکل کہلاتے ہیں اور انہیں جو چیز مختلف کرتی ہے وہ ان کا شدید احساس ہے کہ وہ محاصرے میں ہیں یا وہ گھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی رجعت پسند تحریک ہے جو اپنے قیام سے ہی تناؤ اور تصادم کا شکار رہی ہے محض سیکولر دنیا کے ساتھ اپنے تعلق کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ عمومی طور پر دوسرے

عیسائی فرقوں کے ساتھ تصادمات بھی اس کی بڑی وجہ ہیں۔ یہ لوگ کٹر عیسائی پن اور مورمونزم (وہ فرقہ جسے امریکہ میں جوزف سمتھ نے ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا) کے ساتھ لڑتے رہے۔ ایونجیکل سے تعلق رکھنے والے عیسائی ان دونوں میں سے کسی بھی فرقے کو عیسائیت کی کسی شکل کے طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تحریک سماجی بحران ہی میں آگے بڑھتی رہی ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ دوبارہ پیدا ہونے کے تصور سے خائف رہے ہیں اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے حوالے سے انہیں خدا کی طرف سے نصرت کی یقین دہانی حاصل ہے۔ وہ خدا کے نئے پسندیدہ لوگ ہیں اور پرانے اسرائیلیوں کی طرح وہ ہمیشہ خدا کی طرف سے آنے والے امتحان کا سامنا کرتے رہیں گے اور دنیا ان سے نفرت کرتی رہے گی۔

مسلسل مورچہ بندی کا ان کا خودساختہ تصور حقیقت کے برعکس ہوسکتا ہے۔ امریکہ میں دس کروڑ ایونجیکلز رہتے ہیں اور تقریباً ایک ہزار بڑے ایونجیکل کلیساء موجود ہیں۔ (بڑے چرچ سے مراد وہ چرچ ہیں جن میں سے ہر ایک کی رکنیت دو ہزار افراد سے زائد پر مشتمل ہوتی ہے)۔ ۲۰۰۴ء میں سینٹ میں ان کے ارکان کی تعداد تقریباً نصف تھی جبکہ ایوان نمائندگان میں ان کے ارکان کی تعداد کل ارکان کی تعداد کا ایک تہائی تھی اور امریکی صدر اور اس کی کابینہ کے بہت سے ارکان اور عملہ کے ارکان ایونجیکل فرقہ کی ''شریعت'' پر عمل کرتے تھے۔ ان اداروں میں موجود فیملی ریسرچ کونسل کے ٹونی پرکنز اور سدرن بپٹسٹ کنونشن کے رچرڈ لینڈ جیسے رہنما ایک ہی رونا روتے تھے کہ ایونجیکلز کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہے۔ انہیں سرکاری سکولوں میں عبادت کی اجازت نہیں دی جاتی اور سرکاری عمارتوں پر ''ٹین کمانڈمینٹس'' پر مشتمل اشتہار چپکانے سے روکا جاتا ہے۔ سوشیالوجسٹ کے طور پر کرسچین سمتھ کا کہنا ہے کہ ایونجیکل تحریک کی مضبوطی، اور ایک علیحدہ مذہبی فرقے کے طور پر اپنی پہچان کو قائم رکھنے کی اہلیت کی وجہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اس کا یہ احساس کہ اس کا محاصرہ کیا گیا ہے۔ سمتھ لکھتا ہے کہ اس احساس کے بغیر تحریک اپنی شناخت کھو بیٹھے گی، اپنے مقصد سے دور ہوجائے گی اور یوں بے مقصدیت کا برطرح شکار ہوجائے گی۔

امریکہ میں ایونجیکل تحریک کی اصلی قوت اس کی پرجوش مذہبی قوم پرستی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امریکہ ایک عیسائی قوم ہے جسے خدا نے پوری دنیا میں مسیحی اقدار کو رائج کرنے کی ذمہ داری دے رکھی ہے۔ بہت سے لوگ، جن کا تعلق ایونجیکل فرقے سے ہے، اس بات میں یقین رکھتے

ہیں کہ ''کرسچینا ئزیشن'' اور 'امریکانائزیشن'' ایسے تصورات ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ رکھ کرنہیں دیکھا جاسکتا۔ان کا کہنا ہے کہ صلیب اور علم ایک واحد قومی نقش کو اجاگر کرتے ہیں۔وال بلڈرز، بیٹل کرائی، دی کولیشن آن ریوائیول، دی کرسچین کولیشن، ایگل فورم اور دی فیملی ریسورس کونسل جیسے ایونجیکل گروپ مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں کہ آئین کی بجائے انجیل کو اپنایا جائے اور سول لاء کی جگہ خدائی قانون کو لاگو کیا جائے۔ یہ کرسچین قوم پرست (جنہیں دانشور بعض اوقات ڈومینٹس یا کرسچیٹیس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔کرسچینٹس کی اصطلاح ایک اور قسم کی مذہبی قوم پرستی یعنی اسلام ازم کے ساتھ حیران کن مشابہت رکھتی ہے)۔اس بات پر زور دیتے ہیں کہ روائتی جمہوریت اور کرسچین جیسی اصطلاحات کی نئی تشریح کی جائے جس کے تحت اس نظریے کو تقویت ملے تا کہ ریڈیکل چرچ سیاسی قوت حاصل کر سکے۔کرس ہیجز اس تحریک کو امریکی فاشسٹوں کی تحریک کہتا ہے۔

امریکی ایونجیکلزم کے کائناتی نکتہ نظر میں ریاستہائے متحدہ کو مقدس ومعتبر کا درجہ حاصل ہے۔امریکہ کی قومی کامیابی دراصل خدا کے فضل وکرم کی تصدیق ہے۔امریکہ کے دشمن خدا کے دشمن ہیں۔امریکہ میں جومختلف سروے کئے گئے ہیں،ان کے مطابق امریکی ایونجیکلز کی بہت بڑی تعداد کا یہ عقیدہ ہے کہ عالمی تصادمات میں خدا امریکہ کی مدد کرتا ہے۔اور شاید یہ حقیقت وضاحت کرتی ہے کہ ایونجیکلز کیوں ریاست کی طرف سے شروع کی جانے والی جنگ کی حمایت کرتے ہیں۔ایونجیکلز کے خیالات کے مطابق اس قسم کی جنگیں متحارب فوجوں اور قوموں کے درمیان محض تصادمات نہیں ہیں بلکہ یہ اچھائی اور برائی کی قوتوں کے درمیان کائناتی جنگیں ہیں اور اچھائی کی قوت کی نمائندگی امریکہ اور برائی کی قوت کی نمائندگی امریکہ کے دشمن کرتے ہیں۔ مائیک ایونز جیسے ایونجیکل لیڈروں کے مطابق ۹،نومبر کے حملے اس جنگ کی ڈریس ریہرسل تھے جس کے نتیجے میں دنیا کا خاتمہ ہوگا۔اس نکتہ نظر کی تصدیق کیلئے ہی افغانستان اور عراق کی جنگوں کو شیطانی قوتوں کے خلاف کائناتی تصادم قرار دیا گیا۔سدرن بپٹسٹ کنونشن کے چارلس سٹینلے کہتا ہے کہ ''اب جبکہ ہمارے سامنے ہمارا حقیقی دشمن موجود ہے جو ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے،تو ہم بھی نہتے نہیں ہیں۔ ہمارے پاس طاقت اور ہمت موجود ہے جو ہمیں حضرت عیسیٰ نے خود دی ہے۔اس سے زیادہ قوت اور کیا ہوسکتی ہے۔ خدا اسی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے ''اپنے بیٹے'' کو قبر سے اٹھائے گا۔

مردے کو دوبارہ زندہ کرنے کی طاقت ہماری ہے۔

امریکی تاریخ میں خدا کی پسندیدہ قوم کے طور پر امریکہ کو ملنے والی یہ مقدس حیثیت کوئی نئی بات نہیں۔ تاہم جارج ڈبلیو بش کی صدارت کے دوران امریکہ کی یہ حیثیت عروج کی بلندیوں تک پہنچ گئی اور اس کی وجہ امریکی صدر کا شدت پسندی کی حد تک مذہبی ہونا ہے۔ ۹/۱۱ کے حملوں کے بعد کے دنوں کے دوران بش نے کسی عذر خواہی کے بغیر شعوری طور پر جہاد ازم کے خلاف تصادم کو کائناتی جنگ کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس امریکی ارادے کا اعلان کیا کہ ''دنیا کو بدی سے نجات دلائی جائے گی''۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کرنے کے بعد مہینوں تک بش نے اسامہ بن لادن کو اس کے نام سے پکارنے سے انکار کیا بلکہ وہ اسے ''شیطان'' کے نام سے پکارتا تھا۔ وہی شیطان جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں موجود ہے۔ بش نے نہ صرف امریکہ کو تقدس کا درجہ دیا بلکہ اسے خدا کے ''ابدی انصاف'' کا ایجنٹ قرار دیا۔ (یہ نام اس نے افغانستان میں طالبان کے خلاف فوجی مہم جوئی کے لئے منتخب کیا تھا)۔ وہ تو اس حد تک چلا گیا کہ اس نے ایلس جزیرہ کے ساحلوں پر کھڑے ہو کر امریکہ کو عیسیٰ کی طاقت قرار دے دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ''امریکہ عالم انسانیت کے لئے امید ہے..... یہ وہ روشنی ہے جو اندھیرے میں چمکتی ہے اور اندھیرے کبھی اس پر غالب نہیں آ پائیں گے''۔ ایک ایونجیکل پاسٹر گریگوری بائڈ نے بش کے اس اعلان پر لکھا کہ ''اس تمثال میں جو بات عیسیٰ کے لئے درست ہے (دنیا کی روشنی) تو وہی بات ہمارے ملک کیلئے درست ہے اور جو بات شیطان (اندھیرا) کیلئے ہے وہ ان پر بھی منطبق آتی ہے جو ہمارے ملک کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ہم خدا کے ہیں اور وہ شیطان کے ہم روشنی ہیں اور وہ اندھیرے۔ اس لئے ہماری جنگیں ''مقدس جنگیں'' ہیں۔''

بش نے اپنے طور پر ایونجیکلز میں موجود مذہبی احساس میں شدت پیدا کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ اوریگان کے گڈ شیپرڈ چرچ میں تقریر کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل ولیم جی بوئیکن نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اپنے آپ سے پوچھو کہ یہ شخص وائٹ ہاؤس میں کیوں ہے؟ امریکیوں کی اکثریت نے اسے ووٹ نہیں دیے تو پھر یہ کیوں وہاں ہے؟ اور آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ وائٹ ہاؤس میں اس لئے ہے کہ خدا نے اس وقت کیلئے اسے وہاں بھیجا ہے۔ خدا نے اس لئے اسے وائٹ ہاؤس میں بھیجا ہے کہ وہ نہ صرف امریکی قوم کی قیادت کرے بلکہ تکلیف کے

اس دور میں وہ پوری دنیا کی قیادت کرے''۔

جنرل بوئیکن فوج سے ریٹائر ہو چکا ہے لیکن وہ ایونجیکل مشنری کی ''فیتھ فورس ملٹی پلائر'' نامی تنظیم کے ساتھ منسلک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ''خدا کی سلطنت کے لئے معتقدین کی بڑی فوج تیار کرنے کیلئے لوگوں کی تربیت کی جائے اور پوری دنیا میں ان اہم مقامات پر نہ صرف فوجی مشنری بھیجے جائیں بلکہ وہاں ان کی مستقل تعیناتی کا اہتمام بھی کیا جائے۔''فیتھ فورس ملٹی پلائر درحقیقت ایک منضبط تنظیم ہے جو مالی طور پر بھی مستحکم ہے اور یہ تنظیم ۹/۱۱ کے واقعات کے پہلے سے امریکہ کی مسلح افواج کے ارکان کو، بوئیکن کے لفظوں میں، عیسائی فوج کی شکل دینے میں مصروف ہے۔ مسلح افواج کو ایوانجیکل تنظیم کا حصہ بنانے کا کام فوج کی اعلیٰ ترین سطح پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ پینٹا گان بھی اس سے محفوظ نہیں رہی۔ پینٹا گان میں ایک دوسری بااثر ایونجیکل تنظیم ''دی کرسچین ایمبیسی'' کام کر رہی ہے۔ بریگیڈیئر جنرل رابرٹ کیسلن نے اس گروپ کے فروغ کے لئے تیار کی جانے والی ویڈیو میں فخریہ طور پر کہا کہ ''پنٹا گان میں ''کرسچین ایمبیسی'' حضرت عیسیٰ کی خوشبو ہے''۔

کرسچین ایمبیسی کا مشن بڑا سادہ ہے اور وہ یہ کہ ''اعلیٰ سفارتی اور فوجی حکام کو ایونجیکل عیسائیت کی طرف راغب کیا جائے۔ انہیں اس کا حصہ بنایا جائے تا کہ وہ امریکہ اور بیرون امریکہ اپنے ماتحتوں کو بھی ایونجیکل کا معتقد بنائیں۔ یہ حکمت عملی کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران اخباری رپوٹوں، واچ ڈاگ گروپس اور امریکی فوج کے اندر خفیہ طور پر کام کرنے والے افسروں نے انکشاف کیا کہ ایونجیکل افسر اور فوجی چھاؤنیوں کے فیکلٹی ممبرز اور سروس اکیڈیمیز کے اساتذہ بڑی شدومد کے ساتھ ایونجیکل خیالات وتصورات پھیلانے میں مصروف ہیں اور یہ یہ کام پورے امریکہ میں تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال کولوریڈو کی یوایس ایئر فورس اکیڈمی ہے جو بنیاد پرست ایونجیکل تحریک کا سب سے مضبوط مرکز بن چکا ہے۔ کولوریڈو سپرنگز میں ٹیڈ ہیگرڈ کا نیو لائف چرچ اور جیمز ڈوبسن کا فوکس آن دی فیملی چرچ موجود ہیں جو ہر وقت اکیڈمی کے افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر اتوار کو عبادت اور انجیل کے مطالعہ کے لئے منعقد کی جانے والی ورکشاپوں میں باقاعدگی سے شامل ہوتے ہیں۔ یہ شہر کیمپس کروسیڈ آف کرائسٹ جیسی مشنری تنظیم کا مرکز بھی ہے جس کے

ڈائریکٹر سکاٹ بلوم نے اپنی تنظیم کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ ایئر فورس اکیڈمی کے کیڈٹوں کو حکومت کے تنخواہ دار مشنریوں میں تبدیل کر دے گا۔

۲۰۰۶ء میں ایک ادارے امریکنز یونائیٹڈ نے کلیسا اور ریاست کو علیحدہ کرنے کے حوالے سے آزادانہ طور پر تحقیق کی جس سے پتہ چلا کہ ایئر فورس اکیڈمی کے پادری تسلسل کے ساتھ ایونجیکل کیڈٹوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ اپنے غیر ایونجیکل ساتھیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنائیں اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو وہ ''جہنم کی آگ'' میں جلائے جائیں گے۔ اس تحقیق کے مطابق اکیڈمی کے وہ استاد جو ایونجیکل فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اپنی جماعتوں میں بار بار دہراتے تھے کہ انہیں ''دوبارہ زندگی'' ملی تھی اور وہ اپنے شاگردوں کو اس بارے میں مجبور کرتے کہ وہ اپنے عقیدے سے متعلق بات کریں۔ اکیڈمی کے سرکاری اخبار میں ایک دفعہ کرسمس کی مبارکباد کا جو اشتہار شائع ہوا، فیکلٹی کے تین سو اساتذہ اور عملہ کے ارکان نے، جن میں سولہ شعبہ جاتی سربراہ اور نائب سربراہ اور فیکلٹی ڈین شامل تھے، اس پر دستخط کئے تھے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف یہ اعلان کیا کہ ''حضرت عیسیٰ دنیا کی واحد حقیقی امید ہیں، اور دوسرا کوئی مکتی نہیں دلا سکتا۔ بلکہ کیڈٹوں کی ہمت بندھائی کہ وہ حضرت عیسیٰ پر بات کرنے کی لئے دستخط کنندگان (وہ جنہوں نے اس اشتہار میں نام دیئے تھے) میں سے لوگ تلاش کریں جو بہتر انداز میں بات کر سکتے ہوں۔ اس تحقیقاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایئر فورس اکیڈمی میں ہونے والی یہ سرگرمیاں امریکی آئین میں ہونے والی پہلی ترمیم کی اسٹبلشمنٹ کلاز کی خلاف ورزی ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی تھی۔

اس بات سے اختلاف ممکن نہیں کہ مسلح افواج کے ارکان اپنی روحانی ضروریات پوری کریں (یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ فی زمانہ ایئر فورس اکیڈمی میں اٹھارہ کل وقتی پادری اور پچیس ریزرو پادری کام کرتے ہیں جو تقریباً چار ہزار کیڈٹوں کو مذہبی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ انہیں عبادت کراتے ہیں) لیکن امریکنز یونائیٹڈ کے لئے رپورٹ تحریر کرنے والے محققین کا کہنا ہے کہ ایئر فورس اکیڈمی میں کیڈٹوں کو ایونجیکل فرقے میں داخل کرنے کیلئے شدت کے ساتھ تبلیغ کی جاتی ہے اور یہ عمل اس قدر سرایت کن ہو چکا ہے کہ کیڈٹوں میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ اپنے انسٹرکٹروں کو خوش کرنے کیلئے انہیں اپنے انسٹرکٹروں کے عقیدے کو تسلیم کر لینا چاہیے

اور یہ کہ اکیڈمی سے کامیاب ہوکر نکلنے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے افسروں کے مذہبی عقائد کی نقل کی جائے۔

یہ بات واضح ہے کہ ان ایونجیکل تنظیموں نے فوج ہی کو کیوں اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ فورٹ جیکسن کے قریب موجود ملٹری مشنری آرگنائزیشن جو کیڈٹس انٹرنیشنل کے نام سے موسوم ہے، نے تسلیم کیا ہے کہ مذہبی عقیدے کی تبدیلی کیلئے فوج انتہائی زرخیز زمین ہے۔ ''صف بندی اور ممکنہ ہلاکت خیز تصادم کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اس لئے کیڈٹوں کو ہمہ وقت جھنجھوڑتے رہنا چاہیے اس لئے کہ ایسے لوگ ہی خدا کی آواز سننے کیلئے ہمہ تن گوش رہتے ہیں نسبتاً ان کے جو آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جھنجھوڑے گئے ءلوگ ہی خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہیں''۔

''بہرحال، یہاں کچھ اور بھی چل رہا ہے'' کیڈنس انٹرنیشنل نے خود اعتراف کیا ہے کہ فوجی سپاہی خصوصی طور پر عقیدے کی تبدیلی کا بہترین ہدف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جب یہ عقیدہ بدلتے ہیں تو پھری اپنی ملازمت کے دوران جہاں جہاں بھی جاتے ہیں اپنے نئے عقیدے کا بہتر طور پر پرچار کرتے ہیں۔ کیڈنس انٹرنیشنل، کرسچین ایمبیسی اور کیمپس کروسیڈ فار کرائسٹ (یہ محض چند تنظیموں کے نام ہیں) جیسے ایونجیکل گروپوں کی طرف سے جنگ کے دنوں میں عقیدے کو تبدیل کرنے کی بھرپور اور منظم کوششیں کی جاتی ہیں۔ افغانستان اور عراق کی جنگوں کے دوران مسلمانوں کو ایونجیکل مسیحیت کی طرف راغب کرنے کی منظم کوشش کی جاتی رہی۔ افغانستان اور عراق وہ مسلم ممالک ہیں جن میں عیسائی مشنریوں کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔ اخبارات کی تحقیقات کے مطابق فوجی وردیوں میں ملبوس اور فوجی ٹینکوں میں گھرے ہوئے امریکی سپاہیوں میں انجیل کے نسخے اور ایونجیکل فرقے کے پمفلٹ تقسیم کئے گئے ہیں۔ عراق میں موجود ایک امریکی فوجی پادری کیپٹن سٹیو مائیکل نے فخر سے بتایا کہ ''میں عربی میں شائع شدہ انجیل کے نسخے اور ایونجیکل فرقے کے پمفلٹ عراقیوں میں تقسیم کرتا ہوں جن میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کاش کہ میرے پاس عربی انجیل کے ڈھیروں نسخے ہوتے تاکہ میں ان میں تقسیم کر پاتا''۔

بہت سے عراقی بچوں کو رنگین مزاحیہ کتابیں ملی ہیں جن میں مسلمانوں کو جہنم میں اس لئے جلتا ہوا دکھایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو نجات دہندہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ فلوجہ کی ایک چیک پوسٹ پر ۲۰۰۴ء میں سنی باغیوں کے خلاف امریکی حملہ کے وقت امریکی فوجیوں کو اس بنا پر گرفتار کیا

گیا کہ وہ شہر میں داخل ہونے والے عراقیوں کو چمکتے ہوئے سکے دے رہے تھے۔ سکے کے ایک رخ پر عربی میں لکھا گیا تھا ''تم اپنی ابدی زندگی کہاں گزارو گے؟'' سکے کے دوسرے رخ پر جون کی انجیل کی ایک آیت تحریر تھی جس میں کہا گیا تھا ''خدا کو دنیا سے اسقدر محبت تھی کہ اس نے اپنے واحد جنے بیٹے کو یہاں بھیجا تا کہ جو اس پر ایمان لائے وہ کبھی ختم نہ ہو بلکہ اسے ابدیت حاصل ہو جائے''۔

فلوجہ کے ایک دوکاندار کو جب یہ سکہ دیا گیا تو اس نے کہا ''یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم کمزور ہیں''۔ اس کا یہ فقرہ حقیقی خطرے سے کسی صورت کم نہیں۔

اس قسم کے اقدامات امریکی فوجی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہیں۔ امریکی فوجی ضابطۂ اخلاق کے تحت فوجی سپاہی دوسرے ملکوں میں تعیناتی کے دوران اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔ اس حوالے سے کئی فوجیوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی بھی کی گئی۔ تاہم یونیفارم پہنے ہوئے ان مردوں اور عورتوں کو افغانستان اور عراق کی جنگوں میں ایسا رویہ اختیار کرنے پر سزا دینا عجیب سا لگتا ہے اس لئے کہ جب ابتداء ہی سے فوجیوں کو جہادازم سے بڑے پیمانے کے نظریاتی تصادم کے بارے میں درس دیا جاتا ہے اور ان کے افسر انہیں تربیت کے دوران یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کی جنگ کائناتی جنگ ہے اور جب مسلح افواج کا کمانڈر انچیف یہ اعلان کرے کہ خدا نے اسے افغانستان سے القاعدہ کو ختم کرنے اور عراق میں صدام حسین پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر ان فوجی سپاہیوں کو تبلیغ سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی اخبار ''ہا آریز'' نے ۲۰۰۳ء میں بش کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ یہی بیان بش نے دیا تھا۔ جس کا حوالہ وزیرِ دفاع ڈونلڈ رمسفیلڈ نے صدر کی طرف سے صحافیوں کو دی جانے والی بریفنگ میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ بش کی سوانح عمری لکھنے والے مصنف رابرٹ ڈریپر نے بھی صدر کے اس پیغام کو ''صلیبی جنگوں جیسے پیغامات'' قرار دیا اور اس نے لکھا کہ بش نے اس مقصد کیلئے انجیل کی آیات کا حوالہ دیا (اس لئے خدا کی فوجوں کو حملہ کرنے کا حکم دو تا کہ یوم حساب پر تم اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے رہ سکو') جب فوج کے سیکرٹری پیٹ گیرین عراق کی جنگ کو واضح طور پر امریکہ اور انتہا پسند اسلام کے درمیان

جنگ قرار دیتا ہے اور جب افغانستان میں امریکہ کے فوجی پادریوں کا سربراہ لیفٹیننٹ کرنل گیری ہنسلے اپنے سپاہیوں کو حکم دیتا ہے کہ عیسیٰ کے نام پر اس ملک کی مسلمان آبادی کو ختم کر دو (''ان پر آسمانی کتے چھوڑ دو تا کہ ہم انہیں اپنی بادشاہت میں لے لیں۔ ہمیں یہی کرنا ہے اور یہی ہمارا کام ہے''۔ ہنسلے کی اس تقریر پر مشتمل ٹیپ پکڑی گئی تھی) اس کے علاوہ عراق اور افغانستان میں امریکہ کے انتہائی طاقتور، ڈیفنس کنٹریکٹر ''بلیک واٹر'' کی قیادت، ایرک پرنس جیسا آدمی کر رہا ہو جو خود کو عیسائی صلیبی سپاہی قرار دیتا تھا اور جسے پوری دنیا سے مسلمانوں اور اسلامی عقیدے کو ختم کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ تو پھر عام فوجیوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ سے کیسے روکا جا سکتا تھا۔ یہ تصور کرنا محال ہے کہ یہ نوجوان اور ''پاک صاف'' سپاہی اپنا فوجی مشن اور کس طرح پورا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ وہ اپنی مذہبی تبلیغ کو جاری رکھیں۔ چنانچہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک نئی صلیبی جنگ ایک کائناتی جنگ، اچھائی (امریکی) اور بدی (مسلمان) کی طاقتوں کے درمیان جنگ ہی قرار دی گئی۔

چنانچہ جہادی، امریکی مشن کو اسی نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق اور افغانستان، دونوں ملکوں میں امریکہ کی اس کارروائی نے نہ صرف یہ کہ جہادیوں کی یہ دلیل صحیح ثابت کر دی کہ ''شیطانی فوج'' کی طرف سے شروع کی گئی یہ جنگیں اسلامی دنیا کے خلاف نئی صلیبی مہم ہیں بلکہ اس سے جہادیوں کو کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کرنے کا موقع بھی مل گیا کہ وہ ''اسلام کی تذلیل'' کرنے والی قوتوں کے خلاف دفاعی لائن ہیں۔ عراق اور افغانستان میں امریکی فوجیوں کی طرف سے مسلمانوں کو ایونجیکل مذہب کی طرف راغب کرنے، مسلمان قیدیوں کو زبردستی سور کا گوشت کھلانے اور حضرت محمدؐ کو برا بھلا کہنے پر مجبور کیا گیا تو اِس کا شدید ردِعمل یقینی تھا۔

خصوصاً بن لادن کے مطابق عراق کی جنگ دنیا بھر کے مسلمانوں کو نیند سے بیدار کرنے کی منادی تھی۔ اس جنگ نے مسلمانوں کو غیرت دلائی تا کہ وہ اسلامی روایت کے مطابق کائناتی جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور خدا کے دشمنوں پر حملہ آور ہو جائیں۔ عراق میں امریکی فوجی مہم کی شدت کے دوران بن لادن نے عراقی مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ''میرے عراقی

مسلمان بھائیو! بغداد کے بہادرو، انصار الاسلام کے کارکنو، صلاح الدین کے معتقدو، باقوبہ، موصل اور الانبار کے مجاہدو! خدا کے نام پر اپنے دین کی کامیابی کیلئے لڑنے والے بہادرو، اور اپنے رب کی خاطر اپنے گھر بار، آل اولاد کو چھوڑ کر یہاں آنے والے ساتھیو، اٹھو کھڑے ہو جاؤ اس لئے کہ صلیب کے پرچم تلے رومن ایک بار پھر پیارے محمد ﷺ کی قوم کے خلاف جنگ لڑنے کیلئے تیار ہیں۔ اے خدا ہمیں صبر دے، ہمیں استقامت عطا کر اور کفار کے خلاف جدوجہد میں ہماری مدد فرما۔ یقیناً فتح خدا ہی کی ہوگی''۔

☆☆☆

باب پنجم

نزدیک اور دور

تزخورمتو کا شہر بغداد سے ایک سو میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر عراق کے صوبہ صلاح الدین میں واقع ہے۔ نسلی اور مذہبی طور پر یہ شہر سنیوں، شیعہ، کردوں اور ترکمانوں کی ملی جلی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ اسی وجہ سے یہ شہر ملک میں موجود زیادہ تر غیر ملکی جہادیوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ امریکہ کی فوج انہی غیر ملکی جہادیوں کو القاعدہ کا نام دیتی ہے اسے اے کیو آئی بھی کہا جاتا ہے (اے کیو آئی اسامہ بن لادن کی القاعدہ سنٹرل سے مختلف ہے القاعدہ سینٹرل کا مرکز پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے قریب ہے اور اس کا عراقی انتخابات پر بہت کم اکثر ہوتا ہے) ۲۰۰۳ء میں امریکی مداخلتِ بے جا کے وقت سے تزخورمتو جہادی دہشت گردوں کا مسلسل نشانہ رہا ہے اور یہ وہ جہادی دہشت گرد ہیں جو فلپائن اور ملائشیاء جیسے دور دراز کے علاقوں سے ''کافروں'' اور ''منافقوں'' کے خلاف جنگ کرنے کیلئے عراق آئے تھے۔

یہ دو اصطلاحات یعنی کافر اور منافق جہادی لغت کا مستقل پیوند بن چکی ہیں۔ قرآن میں ان دونوں لفظوں کے خاص معانی ہیں۔ کافر کی اصطلاح عمومی طور پر قبل از اسلام کے مکہ کے طاقتور بے دین حکمرانوں یعنی قریش کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے نومسلموں کے خلاف ایک دہائی تک خون آشام جنگ لڑی تھی۔ منافق کی اصطلاح ان عرب قبائل کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ شامل تو ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ عمل صرف سیاسی یا مادی فوائد کے لئے تھا اور جنہوں نے آخر کار اسلام کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے پرانے قبائلی طور

طریقوں کو اپنالیا تھا۔ جہادازم میں ان دونوں اصطلاحات کے معانی کو ان کے تاریخی حوالے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ہر وہ شخص کافر کہلانے لگا جو مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح ہر وہ مسلمان منافق ٹھہرا جو جہادی نہیں ہے۔ دونوں گروہ ہی بے دین ٹھہرائے گئے اور دونوں کی سزا موت ٹھہری۔

جہادازم اس حوالے سے پاکیزگی (پیوری ٹینیکل) کی تحریک ہے جس کے ارکان صرف خود کو صحیح مسلمان سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق باقی تمام مسلمان منحرف یا بہروپے یا دھوکے باز ہیں جنہیں اپنی منافقت پر پچھتاوا ہونا چاہیے یا انہیں پشیمان ہونا چاہیے اور یا پھر انہیں ان کی تقدیر کے حوالے کر دیا جائے۔ خصوصاً سنی تحریک ہونے کے ناطے جہادازم والے لوگوں میں شیعہ لوگوں کے لئے شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ (یادرہے کہ عراق، ایران اور لیوانت جیسے ملکوں اور ان ملکوں کے اردگرد کے علاقوں میں پندرہ سے بیس فیصد مسلمان شیعہ ہیں)۔ جہادی اُن کو مسلمان نہیں سمجھتے بلکہ انہیں ''راوفضہ'' یا ''ناپسندیدہ'' خارجی کہا جاتا ہے جنہیں کفار اور منافقوں سے کہیں زیادہ برا تصور کیا جاتا ہے اردن کے جہادی ابوالمصعب الزرقاوی، جو ایک معمولی چور اور کم پڑھا، ظالم شخص تھا، نے کہا کہ اسلام کے لئے شیعہ، امریکہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ شخص ۲۰۰۶ء میں مرا اور اپنی موت تک وہ عراق میں القاعدہ کا رہنما تھا۔ زرقاوی کا دعویٰ تھا کہ شیعیت صریحاً شرک ہے اور یہ ایسا عقیدہ ہے جس کا اسلام کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ ''شیعہ لوگ نسل انسانی کی سب سے بڑی برائی ہیں ..... یہ آستین میں چھپے سانپ ہیں۔ یہ دغا باز اور کینہ پرور بچھو ہیں، جاسوسی کرنے والے دشمن ہیں، انسانی جسم میں سرایت کرنے والا زہر ہیں۔ شیعہ لوگوں کو اغوا کر کے، انہیں تشدد کا نشانہ بنا کر اور ان کے سر کاٹ کر زرقاوی نے تن تنہا عراق میں فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا آغاز کیا تھا۔

تزخورمتو کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ شیعوں پر مشتمل تھا اس لئے یہ شہر زرقاوی کے لئے پسندیدہ شکارگاہ بن گیا جس میں اس کے خونخوار جتھے گھومتے پھرتے تھے۔ خودکش جہادی بمبار نے جن کا تعلق عراق میں القاعدہ سے تھا، گاہکوں سے بھرے ہوٹلوں اور چائے خانوں کو جلا کر راکھ کر دیتے۔ تیزخورمتو کی ایک مارکیٹ کو کار بم کے ساتھ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ شہر کی پولیس کو مختلف دھماکہ خیز مواد کے استعمال سے بے بس اور ناکارہ بنا دیا گیا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں تزخورمتو کے شیعوں کی

جامع مسجد کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ شہر کے باہر لاتعداد ایسی قبریں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے ہر قبر میں کئی کئی لاشیں ایسی بھی تھیں جن کے سر کاٹ دیئے گئے تھے۔

تزخورمتو کسی نہ کسی طرح مضبوط اور مستحکم ہوتا رہا۔ باوجود یکہ اس کے کہ لوگوں کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا، شہر میں داخلی طور پر اس سطح پر لوگوں کی بیدخلی اور نسلی یک رنگی نہیں ہوئی جیسے کہ بغداد میں ہوا جہاں ہم نسل نہ ہونے کی بناء پر ہمسائیوں کو بھی بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تزخورمتو کے لوگ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے تھے، ایک دوسرے کے پڑوسی کے طور پر رہتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں کرتے تھے، ایک دوسرے کے مُردوں کو مل کر دفناتے تھے لیکن ان عسکریت پسند پیورٹینز کے گروہوں نے اس یکجہتی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور اس کیلئے انہوں نے قیمت بھی چکائی۔ اپنے انکار کی وجہ سے شہر کو اپنے چہرے پر زخم برداشت کرنے پڑے۔ شہر کے وسط میں، جہاں پہلے پارکنگ کیلئے جگہ مخصوص تھی، اب اس کے آخری کنارے پر جنگی جیپ جتنا بڑا گڑھا بن چکا ہے۔

یہ رمضان کا آخری دن تھا۔ عیدالفطر اگلے روز تھی۔ اسلام میں اس سے بڑا تہوار کوئی نہیں ہوتا۔ اس روز چھٹی ہوتی ہے آخری روزے کے دن دوست اور خاندان اکٹھے ہو کر تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں اور اکٹھے ہو کر روزہ افطار کرتے ہیں۔ بچیاں نئے کپڑے پہنتی ہیں۔ لڑکے بالے چمکتے ہوئے جوتے پہنتے ہیں۔ اٹھائیس روز بعد لوگ رمضان کی آخری رات کو گھروں سے باہر نکلتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔

تزخورمتو کے بزرگوں نے پارکنگ کی اس جگہ کو صاف کر کے عید کے میلے کیلئے تیار کیا تھا۔ وہاں جھولے لگائے گئے، بچوں کیلئے پھسلنے والے سلائیڈ لگائے اور اسی طرح کے دوسرے کھیل کود کے انتظامات کئے گئے۔ شامیانوں میں سوڈا واٹر، سنیکس اور غباروں کے سٹال لگائے گئے۔ لیمپ جلائے گئے۔ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے گیتوں کی آواز دور دور تک سنی جا سکتی تھی۔

ابھی سورج غروب ہی ہوا تھا کہ ایک نوجوان چاکلیٹوں اور کھلونوں سے بھری گھوڑا گاڑی لے کر اندر داخل ہوا۔ وہ نوجوان تزخورمتو میں بالکل انجان تھا۔ کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ کسی کو ہر کوئی جانتا بھی ہو۔ جنگ نے ملک کو برباد کر دیا تھا۔ ہر روز بغداد یا دیالہ یا قریبی قصبے کرکوک سے مہاجرین کے نئے قافلے تزخورمتو میں داخل ہوتے تھے ان قافلوں

میں ٹوٹے پھوٹے خاندان، قابل رحم بیوائیں اور ایسے مرد جن کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہوتا تھا اس شہر میں داخل ہوتے تا کہ نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔

اس نوجوان شخص نے اپنی گھوڑا گاڑی میدان کے مرکز میں لا کر کھڑی کی اور گاڑی میں پڑی اپنی اشیاء کی فروخت کیلئے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ اس نے گھوڑا گاڑی کھولی اور چاکلیٹوں کے ''ڈبے'' کھلونے جانور اور پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا فٹ بال باہر نکالے۔ بچے اپنے کھیل چھوڑ کر اس گھوڑا گاڑی کی طرف بھاگے آئے۔ ان کی مٹھیوں میں وہ پیسے تھے جو انہیں ان کے چچاؤں، ماموؤں اور دوسرے بزرگ عزیز و اقارب نے عید کے لئے دیئے تھے۔ وہ دوڑتے جاتے تھے اور ساتھ ہی اپنی اپنی پسند کی چیز کا نام پکار رہے تھے لیکن اس گھوڑا گاری کے مالک کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ نئی پوشاکیں پہنے لڑکیوں اور نئے چمکدار جوتے پہنے لڑکوں کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ گھوڑا گاڑی والے نوجوان نے بچوں کے قریب آجانے پر آہستگی کے ساتھ گاڑی میں موجود بکس کا ڈھکنا اوپر اٹھایا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ پورے میدان کو دھوئیں کی دبیز چادر نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور یوں سورج کی آخری کرنیں دھوئیں اور دھول کی دبیز چادر میں گم ہو گئیں۔

دہشت گردی کے ایسے واقعات منفی رجحانات اور غیر انسانی سوچ کا بدترین اظہار ہیں اور ایسے واقعات کا کسی بھی صورت دفاع غیر انسانی اور مجہول حرکت ہی تصور کیا جائے گا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دہشت گردی سوچا سمجھا انتخاب ہے۔ دہشت گردی کا انتخاب سوچ سمجھ کر اور ایک مقصد حاصل کرنے کیلئے کیا جاتا ہے۔ اس لئے دہشت گردی کرنے والے گروہوں کیلئے یہ سب سے موثر اور کم قیمت ذریعہ ہے جس سے لوگوں کو اجتماعی طور پر مارا جا سکتا ہے اور زندہ رہ جانے والوں کو ہمیشہ کیلئے خوفزدہ رکھا جا سکتا ہے۔

خودکش دہشت گردی کو بطور حکمت عملی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب یہ حرکت مذہب کے نام پر کی جائے۔ خودکش دہشت گردی اسلام یا کسی بھی مذہب میں انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس حکمت عملی کو تامل ٹائیگرز نے سری لنکا کی حکومت کے خلاف پرتشدد بغاوت کے دوران استعمال کیا۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے پولیٹیکل سائنس کے استاد رابرٹ پیپ نے ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۳ء تک کے دوران دنیا بھر میں ہونے والے تمام خودکش حملوں

کے اعداد و شمار مرتب کئے ہیں۔ اپنی اس رپورٹ میں اس نے لکھا ہے کہ خودکش دہشت گردی اور اسلامی بنیاد پرستی یا کسی بھی مذہب کا آپس میں بس واجبی سا تعلق ہے۔ اس کے مطابق ہر تیسرے خودکش حملے کے ذمہ دار سیکولر گروپس ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی میں خودکش حملے کیوں عام ہوئے تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ ''یہ آسان ترین طریقہ ہے اور اس کے نتائج فوری اور خطرناک ہوتے ہیں''۔ جب کسی کے دشمن کے پاس ہولناک ہتھیار ہوں اور جنگ میں اس کی طاقت کو چیلنج نہ کیا جا سکتا ہو تو پھر خودکش دہشت گردی سب سے مضبوط اور موثر ہتھیار ہوتی ہے۔ ایک فلسطینی دہشت گرد نے ایک اسرائیلی رپورٹر کو سرد مہری سے جواب دیتے ہوئے کہا ''ہمارے پاس نہ جہاز ہیں اور نہ ہی میزائل، یہاں تک کہ ہمارے پاس تو زمینی فوج بھی نہیں ہے جس کے ساتھ ہم بدی کے خلاف لڑ سکیں۔ ایسی صورت میں خودکش حملے ہی موثر ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے کم سے کم انسانی جانوں کے ضیاع کے ساتھ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکتا ہے''۔ عام فہم زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودکش دہشت گرد، غریب آدمی کا سمارٹ بم بن چکا ہے۔

تاہم قتل کرنے اور مرنے کا کوئی جواز نہیں ہے چاہے اس عمل کو مذہبی فریضہ یا رسم و رواج کا حصہ ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہادی اس ناپسندیدہ عمل کو ''شہادت کا عمل'' قرار دیتے ہیں۔ یہ کوئی شکر ریزی کا عمل نہیں (یا یہ کوئی بدعمل نہیں جس سے کوئی ناراض ہو) بلکہ یہ دوسروں پر موت مسلط کرنے کی ایسی سنجیدہ کوشش ہوتی ہے جس سے کائناتی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ ان لوگوں کیلئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ خودکشی کے حوالے سے قرآن پاک بالکل واضح ہے کہ ''خود کو قتل نہ کرو۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اللہ اسے جہنم میں پھینکے گا''۔ ان کیلئے اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی متعدد احادیث میں آیا ہے کہ خود کو مارنے والوں کے لئے سزا منتظر رہتی ہے۔ ''اگر کوئی جان بوجھ کر خود کو پہاڑ سے گرا کر مار لیتا ہے، تو وہ ہمیشہ کیلئے جہنم کی آگ میں جلتا رہے گا۔ جو کوئی زہر پیتا ہے اور اس سے خود کو مار لیتا ہے تو وہ پھر ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہ کر زہر پیتا رہے گا۔ جو کوئی خود کو لوہے کے ہتھیار سے مارے گا تو پھر جہنم میں اس کے ہاتھوں میں وہی ہتھیار ہمیشہ کیلئے رہے گا اور وہ اپنے پیٹ میں اسے گھونپتا رہے گا''۔ قرآن پاک میں عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو قتل کرنے سے واضح طور پر منع کیا گیا ہے۔ قرآن اقلیتوں کو تحفظ دینے کا حکم دیتا ہے اور خصوصاً دوسرے مسلمانوں کے تحفظ کی سختی سے تلقین کرتا ہے۔ کچھ جہادی نظریہ

سازخودکش دہشت گردی اور مسلمان بھائیوں اور شہریوں پر حملوں کو جائز ثابت کرنے کیلئے بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں (بن لادن کا ایک سابق محافظ یوسف الایری، جو سعودی جہادی ہے، کا کہنا ہے کہ اگر لادین بچوں اور بزرگوں کو قتل کرتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی اجازت ہونی چاہیے)۔خود بن لادن نے کہا تھا کہ ''ایک مسئلہ، جس پر تمام لوگ متفق ہیں چاہے وہ خود اس قسم کی کارروائیوں کا شکار ہو چکے ہیں یہ ہے کہ تم معصوم بچوں کو قتل نہیں کر سکتے''۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلام میں پھیلتے ہوئے مسلمان بچوں کو قتل کرنے جیسے جرم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مذہبی توضیع ممکن ہے۔ اسی لئے زیادہ تر جہادی ایسا جرم نہیں کرتے۔ اس کی بجائے وہ ایک سادہ سا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اس طرف جنتی لوگ ہیں جبکہ دوسری طرف جہنمی لوگ ہیں۔ ان میں بیچ کا حصہ کوئی نہیں۔ اگر آپ ایک طرف نہیں ہیں تو پھر آپ دوسری طرف ہیں۔ اگر تم ہم میں سے نہیں ہو تو پھر تم ''ان'' میں سے ہو۔ اگر تم ان میں سے ہو تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم فوجی ہو یا نہیں، تم بچے ہو یا نہیں، مسلمان ہو یا نہیں۔ کائناتی جنگ میں ہر فرد یا تو خدا کے ساتھ ہے یا خدا کے خلاف ہے۔ کوئی معصوم نہیں۔'' الجزائر کے آرمڈ اسلامک گروپ کے ایک رکن کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''جو جنگ ہم لڑ رہے ہیں اس میں غیر جانبداری بے معنی ہے۔ وہ جو ہمارے ساتھ ہیں وہ ہمارے نہیں۔ باقی سب لوگ کافر ہیں اور موت کے حقدار ہیں''۔

اس قسم کے اخلاقی تضاد کے لئے اسلام میں ایک اصطلاح ''الولا، والبرا'' استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب ''وفاداری اور دشمنی'' ہے۔ اسے ''محبت اور نفرت'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ القاعدہ کے نظریہ ساز محمد سعید القحطانی کے مطابق لفظ ''الولا'' قربت، تعلق، لگاؤ کا اظہار کرتا ہے جبکہ لفظ ''برا'' رکاوٹ، دشمنی اور تردید کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے''۔

تاہم یہ اصطلاح کائناتی دوئی کے معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ جس کے مطابق تمام تر تخلیق کو ''معتقدین'' اور ''بے دینوں'' یا ''غیر معتقدین'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جہادی خود کو معتقدین میں شمار کرتے ہیں جبکہ ''غیر معتقدین'' میں غیر مسلموں، شیعہ مسلمانوں اور یورپ و امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو شمار کیا جاتا ہے۔ جہادی یورپ اور امریکہ کو ''دارالکفر'' قرار دیتے ہیں۔ عرب اور مسلم دنیا کے حکمران، اسلام کے روائتی مذہبی اداروں کے ملّا اور رہنما

(جہادی انہیں کفر کے امام کہتے ہیں) اور ہر وہ شخص جو ایسی سیاسی یا مذہبی اتھارٹی کو تسلیم کرتا ہے، جہادیوں کے نزدیک غیر معتقدین یا کافر ہیں۔ جیش محمد کے بانی مولانا مسعود اظہر کہتے ہیں کہ ''کافروں اور معتقدین کے درمیان وہی فرق ہے جو روشنی اور اندھیرے میں ہوتا ہے''۔

اس قسم کے نظریے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن جہادازم میں اسی نظریے کو مذہب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے الزرقاوی اور فلسطینی جہادی ابومحمد المقدسی کی تحریریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ القحطنی تو اس نظریے کو مسلمانوں کے عقیدے کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے ''یہاں کوئی اللہ نہیں سوائے اللہ کے''۔ اس بیانیے کو ''شہادہ'' کہا گیا ہے اور جہادیوں کیلئے یہ اثبات اور نفی دونوں ہے۔ یہ بیک وقت خدا کے قانون کو تسلیم کرنا اور ارضی قوانین کو مسترد کرنے کا عمل ہے۔ جہادیوں کے تصور کے مطابق ''شہادہ'' کا مطلب محض اچھائی کا فروغ ہی نہیں بلکہ بدی کو سختی کے ساتھ روکنا بھی ہے۔ اس کا مطلب محض خدا سے محبت کرنا ہی نہیں بلکہ خدا کے دشمنوں سے نفرت کرنا بھی ہے۔ یک چشمی جہادی مبلغ ابوحمزہ المصری لکھتا ہے کہ ''اگر تم مخلص ہو اور اگر تم واقعی خدا سے محبت کرتے ہو تو پھر تم کافروں کے سائے سے بھی نفرت کرو''۔ ایمن ظواہری یہی بات زیادہ آسان زبان میں سمجھاتا ہے کہ ''جو کافروں سے محبت کرتا ہے وہ بھی کافر ہے''۔

مذہبی نظریے کے طور پر ''الولا''، والبرا' کسی کو بھی یکطرفہ طور پر کافر قرار دینے کے عمل سے تقویت حاصل کرتا ہے۔ جہادی حلقوں میں دوسروں کو کافر قرار دینے کا رویہ عام ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعے کسی مسلمان کو اسلام سے خارج کر دیا جائے۔ نہ ہی اسلام کسی کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیتا ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون مسلمان نہیں۔ تاہم ''تکفیر'' کا رواج انفرادی معتقدین کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان دشمنوں کو کافر قرار دیں۔ جہادی ''تکفیر' کے عمل کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس کا استعمال ان لوگوں پر کرتے ہیں جو ان کے عالمی نظریے سے متفق نہ ہوں۔ مثال کے طور پر وہ مسلمان جو ووٹ ڈالتے ہیں یا سیاسی عمل میں حصہ لیتے ہیں اس تعزیر کے حقدار ہوتے ہیں۔ المصری اپنی کتاب ''تکفیر سے ہوشیار رہو'' میں لکھتا ہے کہ ''وہ لوگ جو جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں اور ووٹ ڈالتے ہیں اور وہ انتخاب جیتنے کی خواہش رکھتے ہیں یا جب انہیں موقع ملے تو قوانین بناتے ہیں تو یہ سب لوگ کفار ہیں۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ کس قدر عبادت کرتے ہیں یا کتنی بار حج کرتے ہیں۔ وہ اپنے

اس عمل کی وجہ سے اسلام کے قریب نہیں آسکتے''۔

صدیوں سے مسلمان علماء فتوے جاری کر رہے ہیں جن میں ''تکفیر'' پر عمل کی مذمت کی گئی ہے یہ علماء اس عمل کو خدائی انصاف کو غصب کرنے کا عمل قرار دے چکے ہیں۔اس لئے کہ اس عمل کا قرآن میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ ۲۰۰۵ء میں دنیا بھر کے ایک سو ستر علماء، مذہبی سکالر جو تمام فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، عمان (اردن) میں جمع ہوئے اور یہ متفقہ فتویٰ جاری کیا کہ ''اسلام میں ''تکفیر'' کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ کہ کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی بنیاد پر کسی دوسرے مسلمان کو کافر قرار دے''۔ جہادیوں نے اس فتوے پر اپنا ردعمل یہ کہہ کر بیان کیا کہ جس کسی نے بھی عمان کانفرنس میں شرکت کی ہے وہ کافر ہے جس کی سزا موت ہے۔اس کانفرنس کے بعد تقریباً چار ماہ کے اندر زرقاوی نے عراق سے چار خودکش دہشت گرد بھیجے جنہوں نے عمان میں ترتیب کے ساتھ خود کو دھماکوں سے اڑالیا جس کے نتیجے میں ساٹھ لوگ مارے گئے جن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔

عام طور پر تکفیر پر عمل کرنے والے اس نظریے کو درست ثابت کرنے کیلئے اسلام کے ایک ممتاز قانونی نظریہ ساز احمد ابن تیمیہ کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔۱۲۶۳ء میں پیدا ہونے والے ابن تیمیہ اسلامی تاریخ میں سب سے ممتاز مفکّر، فلسفی اور ماہر مذہبیات کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے تین سو سے زائد کتابیں لکھیں ان کی پارسائی کے باعث ان کے عقیدت مندوں نے انہیں شیخ الاسلام کا لقب دیا جو کہ اعلیٰ ترین قانونی ماہرین کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

ابن تیمیہ کا تعلق ممتاز مذہبی سکالروں کے خاندان سے تھا۔ان کے والد اور دادا دونوں کا تعلق حنبلی مسلک سے تھا جو سنی مسلمانوں کے چار مسالک میں سب سے زیادہ رجعت پسندانہ مسلک ہے (باقی تین مسالک حنفی، مالکی اور شافعی ہیں)۔ابن تیمیہ نے نو برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور انیس سال کی عمر میں وہ اپنے والد اور دادا کے مسلک حنبلی سے وابستہ ہو گئے لیکن اس سے قبل وہ کئی برس تک دوسرے تین مسالک کے اساتذہ سے بھی درس لیتے رہے۔اس وقت یہ انہونی بات تھی کہ انتہائی رجعت پسند خاندان سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص دوسرے مسالک کے علماء سے بھی استفادہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ ابن تیمیہ کے اس فیصلے نے ان کے والد اور دادا کو بے حد ملول کیا ہو لیکن اس تجربے نے ابن تیمیہ کو اسلامی قوانین کے بارے میں

تقابلی تناظر ضرور مہیا کیا جس کی وجہ سے بعد میں انہوں نے حنبلی تقلید پسندی کے بعض پہلوؤں کو رد کیا حالانکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

ابن تیمیہ کے خاندان کا تعلق بغداد کے قریبی تاریخی شہر ہرن سے تھا جو کبھی عباسی سلطنت کا دارالحکومت ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ایک ثقافتی اور سیاسی مرکز بھی تھا۔ یہ شہر چھ مختلف تجارتی راستوں کے سنگم پر واقع تھا۔ اس شہر کو پانی دریائے دجلہ اور دریائے فرات سے ملتا تھا۔ بغداد، جس کا فارسی میں مطلب ''خدا کا تحفہ'' تھا، امیر ترین شہر تھا جس کی آبادی اس وقت دس لاکھ کے قریب تھی۔ اس طرح اس وقت بغداد دنیا کا سب سے بڑی آبادی والا شہر تھا۔ یہ علم و فضل والا شہر تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ بغداد کا شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو۔ اس وقت یورپ زمانۂ جہالت کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے ہر مذہب اور نسل سے تعلق رکھنے والے سکالر اور دستکار و فنکار بغداد میں امڈے پڑتے تھے۔ وہ یہاں طب، ریاضی، علم ہیئت اور فنون سیکھنے کے لئے آتے تھے۔ شاہی دربار سے منسلک محرر اور منشی دن رات یونانی، لاطینی، شامی، سنسکرت اور فارسی میں موجود علوم کو عربی میں ترجمہ کرتے رہتے۔ عربی اس وقت آرٹس اور سائنس کے حوالے سے رابطے کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ چمڑے اور نرسلوں پر لکھی گئی تحریریں کاغذ کے تازہ صفحات پر منتقل ہوتی رہتیں۔ یاد رہے کہ دنیا کا پہلا کاغذ کا کارخانہ بغداد میں قائم کیا گیا تھا اور اسی کاغذ پر ان تحریروں کو منتقل کیا جا رہا تھا۔ پھر ان تحریروں کو سب سے پرانی لائبریری میں محفوظ کر لیا جاتا جس کا نام ''بیت الحکمۃ'' تھا جس کا مطلب ہے ''ذہانت کا گھر'' اگر اس علمی ذخیرے کو محفوظ نہ کیا جاتا تو آج دنیا افلاطون، ارسطو، فیثا غورث، یوکلڈ، پلوٹینس اور مغربی فلسفے کے دوسرے بڑے بڑے زعما کے افکار سے بے بہرہ ہوتی۔ ان علوم کا اکثر حصہ عربی میں منتقل کیا گیا۔ الجبراء بغداد کی لائبریری میں ایجاد ہوا اور اسی طرح بصارت کی سائنس کی بنیاد بھی وہیں رکھی گئی۔ اناٹومی، فزیالوجی، موسیقی اور میٹریالوجی، منطق اور فلسفہ کو بھی انہی سکالروں نے فروغ دیا جنہوں نے بغداد کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔

لیکن افسوس کہ ایسا تاباں و درخشاں شہر، اس کے آراستہ و پیراستہ غسلخانے، اس کے ہوا میں معلّق باغات، اس کے خوبصورت فوارے، مساجد، عجائب گھر اور لائبریریاں منگول حملہ آوروں کے غیظ و غضب سے نہ بچ سکے جو ''شہروں کے غارتگر'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

تیرہویں صدی کے آغاز میں چنگیز خاں نے وسطی ایشیاء کی سطح مرتفع پر پھیلے ہوئے گھاس سے اٹے میدانوں میں پھیلے خانہ بدوش قبائل کو اکٹھا کر کے انہیں موت اور تباہی کی چلتی پھرتی مشینوں میں ڈھال لیا۔ چند ہی برسوں میں چنگیز خان کی فوجوں نے پورے چین، روس، افغانستان اور ہندوستان کو اپنے طوفان کی لپیٹ میں لے کر ان کے تمام شہروں کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ لاکھوں (کچھ اندازوں کے مطابق ایک کروڑ اسی لاکھ) افراد کو تہہ تیغ کر دیا۔ منگول گھڑ سوار مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے ایران کے تاریخی شہروں مرو، نیشاپور، سمرقند کو روندتے ہوئے اور نظر میں آنے والے ہر ذی روح کو قتل کرتے قبروں کو اکھاڑتے، عمارتوں کو زمین بوس کرتے، لوٹ مار کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

۱۲۵۸ء میں چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان بغداد شہر کے دروازوں پر پہنچ گیا۔ منگول روایت کے مطابق ہلاکو خان نے اپنا پیغامبر عباسی خلیفہ المعتصم کے پاس بھیجا اور اسے پیغام پہنچایا کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور شہر کو اس کے حوالے کر دے۔ جب خلیفہ نے انکار کیا تو ہلاکو کی فوجیں بغداد کی مضبوط فصیلوں کو توڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئیں اور شہر کے باسیوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔

منگولوں نے ہر شے کو جلا کر رکھ کر ڈالا، بغداد کی لائبریری میں رکھی گئی کتابوں کو دریائے دجلہ کی نذر کر دیا۔ دواتوں کی روشنائی سے دجلہ کا پانی سیاہ ہو گیا۔ المعتصم کے پورے خاندان کو بچوں سمیت تہ تیغ کر دیا۔ خلیفہ کو ایک قالین میں لپیٹ کر اس قدر ٹھڈے مارے گئے کہ وہ چند منٹ بعد ہی مر گیا۔ کسی کو معاف نہ کیا گیا۔ ہلاکو کی فوجوں نے بغداد کے علماء منشیوں اور دستکاروں کو جمع کیا اور پھر ان کے سر ان کے دھڑوں سے الگ کر دیئے گئے۔ ان کی لاشوں کو گدھوں، چیلوں اور کوؤں نے کھایا۔ شہر کے وسط میں لوگوں کے کاٹے گئے سروں کا ایک بلند مینار بنایا گیا۔ لاشوں کے گلنے سڑنے سے جو بدبو پیدا ہوئی وہ میلوں دور محسوس کی جا سکتی تھی۔ منگولوں کی خون کی پیاس جب ٹھنڈی ہوئی تو اس وقت تک بغداد انسانوں سے خالی ہو چکا تھا۔

اس تباہی کے دوران ابن تیمیہ کا خاندان دمشق بھاگ گیا۔ یہ خاندان اپنے پیچھے کتابوں کے سوا ہر چیز چھوڑ گیا۔ اس کے باوجود یہ خاندان منگول لشکر سے بچ نہ سکا۔ سقوط بغداد کے چار برس بعد ۱۲۶۰ء میں منگول شام میں داخل ہوئے اور دمشق کو تاخت و تاراج کر دیا۔ تین سال بعد ۱۲۶۳ء میں احمد ابن تیمیہ کی پیدائش ہوئی۔

منگولوں کے حملے کے بعد جو سماجی انتشار اور بحران پیدا ہوا اس نے ابن تیمیہ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ مذہبی غیر یقینی کے دوران جوان ہوا۔ اس وقت ہلاکو خاندان کی نئی نسلیں دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کی بجائے مسلمانوں سے چھینی گئی زمینوں پر آباد ہونا شروع ہو گئیں۔ یہاں انہوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا درحقیقت منگول دوسرے مذاہب کے بارے میں تحمل مزاجی سے کام لیتے تھے اسی لئے انہوں نے اسلامی نظریات اور روایات کو اپنے روحانی نظام میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں سُنّی اسلام اور مشرقی بت پرستی کا مخلوط نظام وجود میں آیا۔ منگول دور حکمرانی میں مسلمانوں کیلئے دشواریاں پیدا ہوئیں۔ بہت سے مسلمان نہیں سمجھ سکے کہ وہ اپنے نئے اور انجانے حکمرانوں کے اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے عمل پر کیسا رویہ اختیار کریں۔ اب جبکہ منگول مسلمان ہو گئے تھے تو مسلمانوں پر لازم ہو گیا کہ وہ انہیں زمین پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ناظم کے طور پر تسلیم کر لیں۔ کیا ان لوگوں کو جنہوں نے چند سال پہلے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا، ان کے بچوں کو غلام بنایا، ان کی جائیدادوں کو لوٹا، ان کی مسجدوں کو جلا ڈالا اور ان کے آباؤ اجداد کی قبروں کو کھود ڈالا تھا، صرف اس لئے مسلمان مان لیں کہ انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''؟

ابن تیمیہ نے فتویٰ کی صورت میں لکھی گئی تحریر میں ان سوالات کا سادہ مگر انقلابی جواب دیا ہے۔ ان کی اس تحریر نے انہیں اپنے حنبلی ساتھی علماء سے مختلف کر دیا اور انہیں جہادازم کا ہیرو بنا دیا۔ یہیں سے آج کے جہادازم کی شروعات ہوتی ہیں۔ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ''منگول بے عقیدہ اور منافق لوگ ہیں جو حقیقت میں اسلام میں یقین نہیں رکھتے۔ منگول لوگوں میں ہر قسم کی منافقت پائی جاتی ہے اور یہ اسلامی عقائد کو ہر طریقے سے رد کرنے والے لوگ ہیں یہ دنیا کے سب سے زیادہ بے علم اور جاہل لوگ ہیں۔ جنہیں نہ تو عقیدے کے بارے میں کوئی علم ہے اور نہ ہی وہ اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہ درحقیقت کافر ہیں اور ان کی اطاعت نہیں کی جا سکتی''۔

یہ فتویٰ اس لئے غیر معمولی بنا کہ اس نے اُس حنبلی مسلک کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی تھی جس کی بنیاد احمد بن حنبل (۷۵۵۔۷۸۰) نے رکھی تھی جس کے مطابق اسلامی ریاست کے رہنما کو چاہے وہ خلیفہ ہو، سلطان ہو یا امام، یہ حیثیت خدا کی طرف سے ملتی ہے اور اس کی اطاعت مسلمانوں پر لازم ہے چاہے اس کے اعمال صالح ہوں یا نہ ہوں۔ ''اماموں کے ساتھ

مل کر جہاد ہوسکتا ہے چاہے ان کا یہ اقدام صحیح ہو یا بدی پر منحصر ہو۔'' ابن حنبل مزید لکھتے ہیں کہ ''جمعے کی نماز، دونوں عیدیں اور حج کی نمازیں سلطان کی امامت میں ادا کرنی چاہئیں چاہے خلیفہ یا سلطان پاکباز ہو یا نہ ہو''۔ ابن حنبل کے نزدیک سماجی نظم وضبط ہر قیمت پر قائم رکھا جانا چاہیے۔ چاہے اس کے لئے کتنا ہی غیر اسلامی قدم کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ مسلمان رہنما ظاہراً جیسا بھی ہو، اس کے احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنے استاد سے اتفاق نہ کیا۔ ''مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کا رہنما آزادی اور انصاف پر مبنی اسلام کی رہنمائی میں زندگی گزارے۔'' ابن تیمیہ نے دلیل دی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر وہ رہنما اسلامی اصولوں پر قائم رہنے میں ناکام رہتا ہے اور اسلامی قانون پر عمل نہیں کرتا تو پھر وہ حقیقی مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوگا۔ اس کی حکمرانی ناجائز ہوگی۔ ابن تیمیہ نے اعلان کیا کہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ فاسق وفاجر رہنما کی حکومت کے خلاف بغاوت کردیں۔ تکفیر پر عمل درآمد کے لئے وہ یہ دلیل بھی دے گئے کہ کافر کی حکومت کو تسلیم کرنے والا بھی کافر ہے۔

اس قسم کے انتہا پسندانہ نکتہ نظر کی پہلے بھی مثالیں موجود تھیں۔ چھ سو سال قبل خارجیوں نے اس وقت ایسی ہی دلیل دی تھی جب انہوں نے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان ابن عفان کی قیادت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ خارجیوں کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے رہنما پر نہ کوئی الزام ہونا چاہیے اور نہ ہی اس نے کوئی گناہ کیا ہو۔ پاکبازی اور علم وحکمت میں وہ تمام مسلمانوں سے برتر ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کی قیادت کرے اور اسے حکمرانی سے نکال باہر کرنے کے لئے ہر طریقہ بروئے کار لانا چاہیے۔

یقینی طور پر ابن تیمیہ خارجی نہیں تھے۔ لیکن وہ اس بات سے متفق تھے کہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام بدعتوں سے معاشرے کو پاک کرنے کیلئے جدوجہد کرے۔ انہوں نے خارجیوں کے اس نظریے سے بھی تقویت حاصل کی کہ دنیا کو دو مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ ایمان والوں (دارالسلام) اور دوسرا عقیدہ بے عقیدہ لوگوں (دارالکفر) پر مشتمل ہو۔ اور پہلے حصے کی کوشش رہنی چاہیے کہ وہ دوسرے حصے کو دارالسلام میں تبدیل کردے۔ وہ انا طولیہ کی سرحد پر رہتے تھے جہاں صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد عیسائی اور مسلمان فوجیں ہمیشہ متصادم رہتی تھیں۔ چنانچہ ابن تیمیہ نے اپنی تمام تر توجہ دارالسلام میں رہنے والے دشمنوں پر مرکوز کر لی تھی۔ یہ دشمن

دراصل وہ مسلمان تھے جو اسلامی شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے۔ ابن تیمیہ انہیں بدعتی کہتے تھے۔ شیعاؤں سے وہ نفرت کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ منگول حملہ آوروں سے شدید نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ ابن تیمیہ کا نکتہ نظر تھا کہ منگول خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن وہ کافر تھے جن کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے۔ ابن تیمیہ نے لکھا کہ ''شام میں آنے والے منگولوں کے خلاف جنگ کرنا سب کا فرض ہے''۔

ابن تیمیہ نے جہاد کے بارے میں نیا تصور دیا جس کے تحت ہر فرد پر جہاد واجب ہے۔ ان کے اس تصور کے برخلاف ان کے دور کے دوسرے مذہبی رہنما جہاد کے صدیوں سے چلے آنے والے تصور پر یقین رکھتے تھے جس کے تحت جہاد ایک اجتماعی فرض تھا۔ اس پرانے تصور کے مطابق جبر و تشدد، ظلم و بے انصافی کے خلاف دفاعی جدوجہد کی اجازت ہی دی جاسکتی تھی اور یہ اجازت بھی مستند امام دے سکتا تھا۔ ابن تیمیہ کے نزدیک جہاد ایک جارحانہ ہتھیار تھا جس کا استعمال ہر شخص کو کرنا چاہیے اور اس کیلئے کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں اور اس کا مقصد اسلام کی ترویج کے ذریعے اسے تمام علّتوں سے پاک کر کے پورے عالم پر غالب کرنا ہے۔ اس طرح ابن تیمیہ نے جہاد کو بندگی یا عبودیت کی اعلیٰ ترین شکل دی۔ انہوں نے ''جہاد کا مذہبی اور اخلاقی نظریہ'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا کہ ''جہاد تمام اقسام کی عبادت پر حاوی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین رضا کارانہ عمل ہے جو کوئی آدمی کر سکتا ہے یہ حج اور عمرہ سے بہتر عبادت ہے۔ یہ رضا کارانہ طور پر ادا کی گئی نمازوں اور روزوں سے زیادہ افضل ہے''۔

اپنی تحریروں کی وجہ سے ابن تیمیہ برسوں جیل میں رہے اور وہیں ۱۳۲۸ء میں انتقال کر گئے۔ اگرچہ ان کے عقیدت مند، خصوصاً ان کے سیکرٹری اور جانشین ابن قیّم الجازیہ نے ایک یا دو نسلوں تک ان کی تعلیمات کو زندہ رکھا۔ ابن قیّم ابن تیمیہ کی تحریروں کو نقل کرتے، دوسروں تک ان کے خیالات پہنچاتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر علماء ''کافر حکمران'' کے حوالے سے ابن تیمیہ کے خیالات کو خطرناک اور بہت ہی انقلابی قرار دیتے تھے۔ چودھویں صدی کے آخر تک جب عثمانیوں نے منگولوں سے مسلمانوں کے علاقے دوبارہ حاصل کرنے شروع کیے تو اس وقت تک شیخ الاسلام کو کم و بیش فراموش کیا جا چکا تھا۔ تاہم اس کے چھ سو سال بعد نو آبادیاتی نظام کے اختتام پر مصر کی پرآشوب سیاسی صورتحال میں ابن تیمیہ کا دیا ہوا سبق قابل عمل ہو گیا۔ یعنی ابن تیمیہ کا دنیا

کو دو حصوں میں تقسیم کرنے اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف تکفیر کا کھلا استعمال اس وقت شروع ہو گیا جب شدت پسند مسلمانوں کے ایک گروہ نے مصری حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی اور پوری عرب دنیا میں انقلاب کی بنیاد رکھی۔

۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء۔ مصر کے جمال عبدالناصر کا منتخب کردہ جانشین انور السادات ۱۹۷۳ء کی مصر اسرائیل جنگ کی یادگار کے حوالے سے ہونے والی فوجی پریڈ دیکھنے کیلئے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا۔ اسی اثناء میں مصری فوج کا ایک لیفٹیننٹ خالد اسلام باؤلی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ پریڈ کرتی ہوئی فوج میں سے اچانک نکلا اور صدارتی چبوترے کی طرف گرنیڈ پھینکتے اور چاروں طرف گولیاں چلاتے ہوئے بھاگا۔ وہ چلا رہا تھا ''موت بر فرعون'' اور اس نے اپنی رائفل انوار السادات کی چھاتی پر خالی کر دی۔

خالد اسلامبولی مصر کی تنظیم ''اسلامی جہاد'' کا رکن تھا۔ یہ تنظیم ان درجنوں جہادی تنظیموں میں سے ایک ہے جن کے مراکز قاہرہ یونیورسٹی کے آس پاس قائم ہیں یہ وہ علاقہ ہے جو انتہا پسند کارکنوں سے اٹا ہوا ہے۔ ان گروہوں میں سوائے ایک کے اور کوئی قدر مشترک نہیں۔ اور وہ واحد قدر مشترک حکومت کے خلاف ان کی نفرت اور مسلم برادر ہوڈ کی طرف سے ہونے والی دغا بازی اور غداری کا شدید احساس ہے۔ یہ احساس مصر کی سیاسی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان متعدد تنظیموں کے ارکان نوجوان ہیں جن کا تعلق پیشہ ور متوسط طبقے سے ہے لیکن وہ بھی مصری سماج کے روحانی تنزل پر بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ان لوگوں میں سائنسدان، انجینئرز، سکولوں کے اساتذہ اور بیوروکریٹس شامل ہیں۔ اور یہ سب لوگ ان کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے کے لئے ہر وقت تیار اور مستعد رہتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ مسلم کمیونٹی کی پاکیزگی کو پامال کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ خاص طور پر ان میں سے ایک گروہ ''تکفر والہجرہ'' خاصا مضبوط ہے۔ اس کی قیادت دو افراد کرتے ہیں جن میں سے ایک سید امام (عرف ڈاکٹر فضل) اور دوسرا شکری مصطفیٰ کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں لیکن وہ کون ہیں کوئی نہیں جانتا۔ یہ گروہ تکفیر پر اس قدر عمل درآمد کرتے ہیں کہ اس گروہ نے مذہبی اداروں کے ارکان کو اغوا کر کے قتل کرنا شروع کر دیا اس لئے کہ یہ لوگ اس گروہ کے نزدیک کافر ہیں۔

انوار السادات کے قتل کے حوالے سے ان شدت پسند تنظیموں کے تین سو سے زائد ارکان کو

گرفتار کر کے جیلوں میں پھینک دیا گیا۔ ان کے خلاف مقدمات کی سماعت کے دوران مقدمے کی پیروی کرنے والے وکلاء نے ایک غیر معمولی دستاویز عدالت میں پیش کی جسے قتل کی سازش میں ملوث اسلامبولی کے ایک ساتھی محمد عبدالسلام فراج نے تحریر کیا تھا۔ اس تحریر کا عنوان تھا ''غفلت کردہ فرض''۔ (The Neglected Duty) یہ تحریر اور کسی حد تک مڑا تڑا پمفلٹ عوام کے لئے نہیں تھا۔ یہ تنظیم کے اندرونی حلقوں کے لئے تھا جس میں متعدد قانونی اور مذہبی دلائل دیئے گئے تھے جن کے تحت سادات کے قتل کو جائز قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا تھا جو مصر کے مذہبی رہنماؤں خاص طور پر الازہر کے سکالروں کی طرف سے اٹھائے جانے تھے اور اس میں واضح کیا گیا تھا کہ سادات کا قتل کیوں جائز تھا۔

فراج نے سادات کے قتل کی وجۂ معقول کی بنیاد ابن تیمیہ کی تحریروں پر رکھی تھی۔ اس نے ابن تیمیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے جواب میں لکھا کہ ''آج کے حکمران اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور یہ لوگ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ یہ حکمران نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں''۔ فراج کے مطابق منگول حکمرانی ان قوانین سے بہتر تھی جنہیں مغرب نے مصر جیسے ممالک پر مسلط کر رکھا ہے اور جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یا کسی بھی مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ فراج نے استدلال دیا کہ اسرائیل کے ساتھ امریکی صدر جمی کارٹر کے دباؤ پر امن کا معاہدہ کر کے (۱۹۷۸ء کا کیمپ ڈیوڈ معاہدہ) سادات نے بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ اس طرح وہ مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں رہا تھا۔ وہ کافر تھا اس لئے اب ہر مسلمان کا فرض تھا کہ وہ اسے قتل کر دے۔

''فرض کی غفلت'' جیسی اصطلاح کے استعمال نے پہلی بار نومولود جہادی تحریک کی تمناؤں اور آرزوؤں کو عام کیا۔ ان خواہشوں میں سب سے اہم خلافت کا دوبارہ قیام تھا جس کو پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کی نئی سیکولر ریاست کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے ختم کر دیا تھا۔ بہت سے مسلمانوں کا خیال تھا کہ چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی قائم کی ہوئی مسلم امہ کو خلافت کے خاتمے نے اپاہج بنا دیا تھا اور اب اقوام عالم میں مسلم امہ کے لئے کوئی مقام نہیں رہ گیا تھا۔ تمام جہادی نظریہ سازوں میں غالباً سب سے ممتاز اور جید عالم سید قطب نے دعویٰ کیا تھا کہ خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمان قوم قبل از اسلام جاہلیت اور بت پرستی کے دور میں واپس

چلی گئی ہے۔

قطب نے اپنے مشہور اعلامیہ ''سنگ میل'' (Milestone) میں لکھا کہ ''جہالت کی بنیاد زمین پر خدا کی حاکمیت کے خلاف بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تحت خدا کی حاکمیت فرد کو منتقل کی جاتی ہے اور یوں کچھ افراد دوسروں کے حاکم بن بیٹھتے ہیں اور یہ لوگ اپنے طور پر اقدار بناتے ہیں، مشترکہ رویے کے قوانین مرتب کرتے ہیں اور اپنی مرضی کے تابع زندگی گزارتے ہیں اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ خدا تعالیٰ ان سب کے بارے میں کیا احکامات دیتا ہے''۔ قطب کہتا ہے کہ ''دوسرے لفظوں میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی امہ کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے''۔ جہادی تحریک میں شامل دوسرے لوگوں کی بھی یہی سوچ ہے۔

بہرحال فراج اس بات پر بضد رہا کہ ''اسلامی ریاست کی حمایت کے بغیر خلافت قائم نہیں کی جاسکتی''۔ اس وقت جہاد ازم واقعی ایک اسلامی تحریک کے طور پر وجود رکھتی تھی۔ اور اس کا مقصد عالمی تغیر کی بجائے مقامی حکومتوں کو گرانا تھا۔ خراج لکھتا ہے کہ ''اپنے نزدیکی دشمن کے ساتھ لڑنا دور کے دشمن کے ساتھ لڑنے سے بہتر ہے''۔

اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ سادات کے قتل کے حوالے سے فراج کی پیش کردہ وجہ کو الازہر کے علماء نے فوری طور پر مسترد کر دیا۔ ''فرض سے غفلت'' میں جو دلائل دیئے گئے تھے ان کو رد کرتے ہوئے مصر کے مفتی اعظم شیخ جدّ الحق نے فراج کے اٹھائے گئے ایک ایک اعتراض کو دلائل کے ساتھ مسترد کیا جو ملک کے سب سے بڑے اخبار الاہرام میں شائع ہوئے تاکہ عام لوگ بھی پڑھ سکیں۔ یہ جواب فتاویٰ کی شکل میں دیئے گئے تاکہ انہیں مذہبی حیثیت دی جاسکے اور چونکہ فراج کوئی مذہبی عالم نہیں تھا اس لئے مفتی اعظم کے دیئے گئے دلائل لوگوں کے لئے بہت زیادہ قابل قبول تھے۔ جدالحق نے جہادیوں کو خارجی قرار دیتے ہوئے فراج کی اس منطق کو رد کیا کہ مصر کو اسلامی ملک قرار نہیں دیا جاسکتا اور یہ کہ اس کے سیاسی اور مذہبی رہنما کافر ہیں۔ جدالحق نے اپنی دلیل میں کہا کہ ''مصر میں نمازیں ادا کی جاتی ہیں، ہر جگہ مسجدیں موجود ہیں اور ہر وقت کھلی رہتی ہیں، مذہبی ٹیکس باقاعدگی سے ادا کئے جاتے ہیں، لوگ حج کے لئے مکہ جاتے ہیں اور مصر کے کونے کونے میں اسلام کا راج ہے۔'' شاید کچھ معاملات ایسے تھے، جیسے سود خوری، جن کے حوالے سے حکومت اسلامی قانون پر مکمل طور پر عمل درآمد نہیں کراتی تھی۔ بقول جدالحق ''اس سے یہ ثابت نہیں

ہوتا کہ یہ ملک اس کے لوگ، اس کے حکمران اور رعایا سب کافر ہیں''۔

مفتی اعظم نے فراج کے ''فرض سے غفلت'' میں اٹھائے گئے نکات کو صحیح طور پر مسترد کر دیا تھا، فراج نے اپنی تحریر میں کہیں یہ نہیں بتایا کہ مصر کو مزید اسلامی ملک کیسے بنایا جا سکتا تھا وہ نہ تو کسی ایسے شخص کے ساتھ بحث میں الجھنا چاہتا تھا جس کی مذہبی اہلیت کو وہ سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی وہ حکمرانی کے بہتر متبادل معیار تجویز کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ یہ سب کچھ اس کے اپنے اور اس کے جہادی ساتھیوں کے نزدیک کوئی معانی نہیں رکھتا تھا۔ فراج کے نکتہ نظر کی صحت کے بارے میں الازہر کے علماء میں جو بحث مباحثہ ہوا اس کی وجہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے اور اس کے حملہ آور ساتھیوں نے یہ تیاری نہیں کی تھی کہ سادات کی موت کے بعد انہیں کیا کرنا ہوگا۔ لگتا ہے کہ اس حوالے سے ان کے ذہنوں میں کوئی خیال آیا ہی نہیں تھا۔ فراج کا مترجم جوہانس جانسن لکھتا ہے کہ اس قسم کی تیاریاں ان لوگوں کے نزدیک غیر اہم تھیں۔ اس لئے کہ جہادیوں کا ماننا تھا کہ جب مسلمان خدا کے حکم کے مطابق جہاد شروع کرتے ہیں اور کافروں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو پھر خدا خود ہر چیز کا خیال رکھتا ہے۔ جب اسلامی ریاست کے قیام کی راہ میں پہلے قدم کے طور پر نظام خلافت کو دوبارہ قائم کرنے کے منصوبے پر فراج سے سوال کیا گیا تو اس نے جواب میں کہا کہ ''اسلامی ریاست کا قیام حکم خداوندی بجالانا ہے۔ اس کے نتائج کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ جب کافروں کی حکومت گرے گی تو پھر ہر چیز مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوگی''۔ ''جب فرعون کی فوجوں کے خلاف کائناتی جنگ ہو رہی تھی تو اس وقت انسانوں نے کون سی تیاریاں کی تھیں یہ جنگ بھی تاریخ کی حدود و قیود سے ماورا ہے''۔

سادات کے قتل کے جرم میں خراج کو اسلامبولی اور مصری اسلامی جہاد کے دو دوسرے ارکان سمیت موت کی سزا دی گئی۔ مصری پولیس نے جن باقی جہادیوں کو گرفتار کیا تھا، انہوں نے قید کی سزائیں کاٹیں۔ ان گرفتار ہونے والوں میں مادی کا ایک کتاب دوست، چشمہ پہننے والا سرجن ایمن ظواہری بھی تھا۔ مادی، قاہرہ کے قریب ایک مالدار قصبہ ہے۔

سکالروں اور ماہرین طب کے ایک خوشحال اور کامیاب خاندان کے فرد ظواہری نے نوجوانی کے زمانے ہی میں مصری مسلم برادر ہڈ میں شمولیت اختیار کر لی تھی لیکن اسلامبولی اور فراج کی طرح اس نے بھی اس گروپ سے اس وقت علیحدگی اختیار کر لی جب انہوں نے سماجی

سرگرمیوں کو تشدد پر ترجیح دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے پسندیدہ فردسید قطب کی پھانسی کے بعد ظواہری نے اپنے یونیورسٹی کے چند دوستوں کو جمع کر کے ایک خفیہ سیل قائم کیا جس کا مقصد ناصر کی حکومت کا تختہ الٹ کر مصر کو اسلامی ریاست میں منتقل کرنا تھا۔ اس کا عمل بچگانہ تھا لیکن جب ناصر کی موت ہوگئی اور اس کی جگہ انوار السادات نے لے لی، تو ظواہری نے مصری اسلامی جہاد کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس میں اس کے دوست اور ساتھی شامل تھے۔

اگرچہ بعد میں ظواہری اس تنظیم کے قیام کے بنیادی ذمہ دار افراد میں خود کو شامل کرنے پر فخر کرتا تھا لیکن وہ انوار السادات کے قتل والی صبح سے پہلے تک یہی کہتا رہا کہ اسے قتل کے اس منصوبے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے مصری پولیس کے سامنے اعتراف کیا کہ اسے اسلامبولی کے اس منصوبے پر حیرت ہوئی اور وہ ہل کر رہ گیا تھا۔ اس کے اعترافی بیان کے باوجود اسے جیل میں پھینک دیا گیا جہاں تشدد کے باعث اس نے اپنے حامیوں اور تنظیم کے ساتھیوں کو دھوکہ دیا۔ چونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس سازش میں اس کا براہ راست کوئی حصہ نہ تھا، اس کو جیل میں پانچ سال سزا کاٹنے کے بعد رہا کر دیا گیا اور وہ فوری طور پر پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے قریبی پاکستانی شہر پشاور چلا گیا اور وہاں ریڈ کریسنٹ میں ملازمت کر لی اور روس کے خلاف جنگ میں زخمی ہونے والے عرب فوجیوں کو طبی امداد مہیا کرتا رہا۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے دوران افغانستان اپنے ملکوں سے بھاگنے والے جہادیوں کے لئے محفوظ جگہ بن چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس سے دو دہائیاں قبل سعودی عرب سلفیوں اور مسلم برادر ہڈ کے انتہا پسند ارکان کے لئے محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جہادیوں کے لئے افغان جنگ، فیصلہ کن لڑائی اور گوریلا جنگ کی مہارت حاصل کرنے کیلئے تربیتی محاذ بن گئی تھی اور یہ تربیت ان کے ملکوں میں قوم پرستانہ جدوجہد کے لئے مفید ہو سکتی تھی۔ تیونس، مصر، ترکی، الجزائر اور ترکمانستان کے درجنوں جہادی گروپوں نے پورے علاقے میں اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ تقریباً سبھی گروہ اپنے قریبی دشمن کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتے تھے اور وہ ابھی تک عالمی سطح پر رونما ہونیوالے واقعات وحادثات سے پوری آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ باوجود یکہ وہ روسی مداخلت کے خلاف متحد تھے لیکن ان کے درمیان قدر مشترک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہر کیمپ اپنے اپنے لیڈر کی اطاعت کرتا تھا اور ہر کیمپ مختلف دھارا رکھتا تھا، ان کا نکتہ نظر مختلف

تھا، ان کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن اس کے باوجود وہ ایک بڑی جہادی تحریک میں شامل تھے۔ یہاں پر ازبک مجاہدین، مراکش کے اسلامک فائٹنگ گروپ، لیبیئن اسلامک فائٹنگ گروپ، ڈاکٹر فضل کی تکفیر الہجرا کے ارکان، ظواہری کا مصری اسلامی جہاد (یہ تنظیم اس نے اپنی قیادت میں سادات کے جانشین حسنی مبارک یعنی مصر کے نئے فرعون کا تختہ الٹنے کے لئے قائم کی تھی) مصر کا ایک اور جہادی گروہ مصری اسلامی گروپ، دی غرابہ (شامی جہادی ابو مصعب الصوری کا کیمپ) اور مکتبہ الخدمت المجاہدین العرب، جس کا سربراہ فلسطینی کرشماتی شخص عبداللہ یوسف عظام تھا، افغانستان میں موجود تھے۔ یاد رہے کہ عبداللہ یوسف عظام کو سب سے زیادہ مالی امداد فراہم کرنے والا اسامہ بن لادن ہی تھا جو اس وقت تک ایک شرمیلا، دبلا پتلا آدمی تھا لیکن عبد اللہ یوسف عظام کا انتہائی پسندیدہ شخص تھا۔

اسامہ بن لادن ۱۹۷۳ء میں عظام سے ملا جب مسلم برادر ہڈ کا سابق محرک عظام اردن سے سعودی عرب بھاگ گیا تھا۔ اور اس نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا جہاں اسامہ بن لادن طالب علم کے طور پر موجود تھا۔ اسامہ انجینئرنگ کا طالب علم تھا، اگرچہ عظام کو یونیورسٹی میں اسلامی فقہ کے پروفیسر کے طور پر رکھا گیا تھا لیکن اس کی زیادہ تر توجہ مکتبہ الخدمت المجاہدین العرب کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے پر ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لئے سعودی حکومت فنڈ مہیا کرتی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد افغانستان میں روسی فوج کے خلاف لڑنے کیلئے دنیا بھر کے اسلامی ملکوں سے جنگجوؤں کو بھیجنا تھا۔ عظام ہی وہ شخص تھا جس نے جہادی تحریک کو شہرت دی۔ ۱۹۸۴ء میں شائع ہونیوالا اس کا رسالہ الجہاد، جس کی سرکولیشن بہت زیادہ تھی، پوری دنیا میں عالمی جہاد کے نظریے کو پھیلانے میں مدد و معاون ثابت ہوا۔ عالمی واقعات کو وہ جہادازم کی عینک سے دیکھتا (خاص طور پر جنگ افغانستان) اور لوگوں کو اسی حوالے سے متحرک کرتا تھا۔ عظام نے تن تنہا مقامی جہادی گروپوں کو عالمی معاملات کے بارے میں شعور دیا۔ عظام نے اپنی کتاب ''ڈیفنس آف دی مسلم لینڈز'' میں لکھا کہ ''جہاد مشرق سے مغرب تک کے تمام لوگوں پر واجب ہے''۔

عبداللہ عظام نے بن لادن پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ بن لادن ریاض میں سعودی عرب کے ایک انتہائی امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس خاندان کے شاہی خاندان سے قریبی

تعلقات تھے۔ بن لادن کا والد محمد بن لادن ایک تعمیراتی کمپنی کا مالک تھا جس نے اسے سعودی عرب کا امیر ترین شخص بنا دیا۔ دوسرے سعودی لوگوں کی طرح محمد بن لادن کو بھی سعودی عرب سے باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کم علم تھا۔ عظام نے بن لادن خاندان کو افغانستان، فلسطین، چیچنیا اور کشمیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے حوالے سے دنیا بھر میں ممتاز بنا دیا۔ اس فلسطینی انقلابی نے اسامہ بن لادن کو اس قدر متاثر کیا کہ پہلی ملاقات کے تین سال بعد ۱۹۷۹ء میں اسامہ بن لادن نے تعلیم کو خیر باد کہا اور عظام کے ساتھ پشاور آ گیا جہاں اس نے اپنے سابق استاد کی مدد کرتے ہوئے ان رضا کار جنگجوؤں کیلئے کئی مہمان خانے تعمیر کروائے جو عظام کے زور دینے پر سوویت یونین کے خلاف جہاد کرنے کے لئے یہاں آنا شروع ہو گئے تھے۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کن حالات میں اسامہ بن لادن پہلی بار عظام سے ملا۔ پاکستان اور افغانستان میں بہت سے کیمپ لیڈرز سعودی امراء کی مدد کے خواہاں تھے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ افغان سرحد پر موجود مہاجر کیمپوں میں اس کی رہائش نے ظواہری کو مزید انتہا پسند بنا دیا اور وہ تکفیر کے نظریہ کو اپنے مصری ساتھی ڈاکٹر فضل سے بھی زیادہ تسلیم کرنے لگا۔ تکفیر کا نظریہ جہادی کیمپوں میں وائرس کی طرح پھیلنے لگا اور اس طرح تمام تنظیمیں ایک مشترک تشخص کے تحت یکجا ہو گئیں۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ جو ان کے ساتھ تھا وہ صاحب ایمان تھا اور جو ان میں سے نہیں تھا، وہ کافر قرار پایا۔ تکفیر ایک ایسے آلے کے طور پر پر استعمال ہونے لگا جو جہادی جنگجوؤں کو ان سے الگ کرتا تھا جنہیں وہ اپنے اپنے ملکوں میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ''اگر آپ افغانستان میں ہونیوالے جہاد کی حمایت نہیں کرتے تو آپ کافر ہیں۔ اگر آپ عرب حکومتوں کی حمایت کرتے ہیں تو آپ کافر ہیں۔ اگر آپ مذہبی اداروں سے مذہبی ہدایت لیتے ہیں تو بھی آپ کافر ہیں''۔ یہ تھا ان کا نکتہ نظر۔

یہ تکفیر کا عقیدہ تھا جسے ظواہری تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے آخر کار ظواہری اور عبداللہ عظام کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی۔ عظام اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ کرنے کو مفید نہیں سمجھتا تھا چاہے وہ کتنے ہی بدعتی رہنما کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ افغانستان میں اپنی کارروائیوں کے لئے اسے سعودی ریاست سے بھاری رقوم وصول ہو رہی تھیں اس لئے سعودی حکمرانوں کو ناراض کرنے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ بن لادن کی وفاداری اور اس سے بھی زیادہ اس کی

دولت کے حوالے سے عظام اور ظواہری میں شدید رقابت پیدا ہوگئی۔ظواہری کی شدید خواہش تھی کہ مصر میں انقلاب لانے کے لئے مصری جہادیوں کے لئے بن لادن اسے مالی امداد میسر کرے جبکہ عظام چاہتا تھا کہ بن لادن کی دولت افغانستان میں تمام جہادی کیمپوں پر استعمال ہوتا کہ ایک عالمی سطح کی جنگجو قوت تیار کی جاسکے جو پاکستان کشمیر اور خود عظام کے ملک فلسطین میں جہاد کرے۔

افغانستان میں شکست کے بعد روسی فوجوں کے انخلاء کے چند ماہ بعد ہی نومبر ۱۹۸۹ء میں عبداللہ عظام کو قتل کر دیا گیا۔آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ عظام کو کس نے قتل کیا تاہم اس کا الزام ظواہری پر ہی لگایا جاتا ہے جو بن لادن کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا تھا۔عظام کے قتل کے بعد بھی ظواہری جس کی توجہ مصر کے ''قریبی دشمن'' پر مرکوز تھی، اور بن لادن کے درمیان گہری خلیج حائل رہی۔ظواہری کے برعکس بن لادن کی خواہش تھی کہ افغانستان میں جہادیوں کے تمام کیمپوں کو ایک جھنڈے تلے یکجا کیا جائے تا کہ ''دور کے دشمن'' پر توجہ مرکوز کی جاسکے۔مختصر الزیاد کے مطابق (جس نے ظواہری کی سوانح حیات لکھی) بن لادن نے ظواہری کو مشورہ دیا کہ مصر میں مسلح آپریشن فوری اور مکمل طور پر بند کر دیئے جائیں اور اس کے (بن لادن) ساتھ مل کر مشترکہ دشمنوں یعنی امریکہ اور اسرائیل کے خلاف محاذ بنایا جائے۔

ابتداء میں افغانستان میں ظواہری سمیت کچھ جہادیوں نے بن لادن کے عالمی فوکس کے نظریے کو تسلیم کیا تاہم ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملے اور اس کے نتیجے میں سعودی حکومت کی طرف سے سعودی عرب میں امریکی فوجوں کی تعیناتی کر کے عراقی فوجوں کو کویت سے نکالنے کے فیصلے نے بن لادن کے اس نکتہ نظر کو قوت دی کہ عرب اور مسلم دنیا کے رہنما بڑی طاقتوں کی کٹھ پتلیاں ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام جہادی قوتیں اپنی تمام تر قوت امریکہ کے خلاف استعمال کریں جو ان ملکوں کی تاریں ہلاتا اور اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔چونکہ دولت سعودی حکومت کے پاس تھی اس لئے ظواہری اور اس کے دوسرے اتحادی جہادیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بن لادن کے ساتھ مل جائیں (جسے اب القاعدہ کہا جاتا ہے)۔ظواہری کے انتہا پسند سلفی ازم اور بن لادن کی وہابیت کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے جہاد ازم کا نیا عالمی چہرہ پیش کیا جائے۔جس کا نشانہ ''قریبی دشمن'' کی بجائے ''دور کا دشمن'' ہو۔یہ نئی شکل ۱۹۹۸ء میں اس وقت

سامنے آئی جب ان دو افراد نے چند دوسرے جہادی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ''ورلڈ اسلامک فرنٹ'' کے قیام کا اعلان کیا۔ اس فرنٹ نے اپنے تئیں ایک سرکاری فتویٰ جاری کیا جس میں نئے ایجنڈے کی وضاحت پیش کی گئی۔ اس میں کہا گیا ''امریکیوں اور ان کے حامیوں کو چاہے وہ فوجی ہوں یا شہری (غیر فوجی) قتل کرنا ہر فرد کا فرض ہے، یہ ہر مسلمان پر لازم ہے''۔

ایسا لگتا تھا کہ اب جہاد ازم عالمگیریت اختیار کر چکا تھا اور باقی سب تاریخ کا حصہ بن چکا تھا۔ ورلڈ اسلامک فرنٹ کے قیام کے بعد ۹/۱۱ کے حملوں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ اور افغانستان اور عراق میں ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کے بعد سے امریکی ایک ہی سوال پوچھتے ہیں ''وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' اس سوال کا جواب دینے کیلئے ایک پوری کاٹیج انڈسٹری وجود میں آچکی ہے۔

بہت سی شکایات ہوں گی جو حملوں کا سبب بنیں لیکن ۹/۱۱ کے پیچھے تذویری مقصد واضح تھا اور وہ تھا اسلامی قوم کو جگانا جسے سلا دیا گیا تھا اور انہیں تصادم سے دور کر دیا گیا تھا۔ ابو مصعب الصوری کے مطابق ہمارے اور ہمارے حقیقی دشمن کے درمیان تصادم مسلط کر دیا گیا تھا۔ الصوری کا یہ اصرار دہشت گردی کے بارے میں بنیادی سچائی کو تقویت فراہم کرتا ہے۔ خاص نتائج کے حصول کے لئے یہ کوئی اہم اقدامات نہیں تھے بلکہ یہ تو محض سامعین کی مخصوص جماعت کے لئے قوت کے اظہار کے علامتی بیانات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ دہشت گردی کے عمل کے پیچھے جو بھی سیاسی، اقتصادی یا فوجی ایجنڈا رہا ہو، اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور بعض اوقات تو دہشت گردی کے بنیادی مقصد کے حوالے سے بالکل غیر مناسب ہوتی ہے۔ اس کا مقصد تو خوفزدہ کرنا ہے۔ (لفظ دہشت گردی (terrorism) لاطینی لفظ terrere سے لیا گیا ہے جس کا مطلب کسی کو تھرانا ہے) یہی وجہ ہے کہ دہشت گرد کا سب سے کارآمد ہتھیار بندوق نہیں بلکہ ٹیلی ویژن کیمرہ ہوتا ہے۔ تماشے کے طور پر تشدد کی تھیٹر ائی تشکیل بھی دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ دہشت گردی نہیں رہتی۔

سچ تو یہ ہے کہ نو نومبر کو امریکہ پر حملہ کرنے والے جہادیوں کے نزدیک نہ تو انہیں کوئی مقصد حاصل ہوا اور شاید نہ ہی وہ کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ امریکہ کی معاشی فوقیت اور اس کی فوجی برتری کو نیچا دکھانا مقصود تھا اور لوگوں تک یہ پیغام پہنچانا تھا کہ امریکہ سے کہیں بڑی ایک

اور طاقت بھی ہے اور وہ ہے خدا کی قوت جو گتے کے بکسوں کو کاٹنے والے آلات اور خدا کی مرضی سے بڑے سے بڑا کام دکھا سکتی ہے۔ ان کی خواہش محض لوگوں کو مارنا نہیں تھا بلکہ دنیا کو یہ بتانا تھا کہ امریکہ کی طاقت، اس کی قوت کس قدر ہے کہ وہ خود کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور یہ واضح کرنا بھی تھا کہ خدا کے اِن سپاہیوں کے پاس کس قدر طاقت ہے کہ وہ جو چاہیں خدا کی مرضی سے کر سکتے ہیں۔ قدیمی فلسطین کے سرگرم اور پُر حرارت لوگوں، جدید اسرائیل کے شدت پسند مذہبی صیہونیوں اور صلیبی جنگوں کے سرداروں اور امریکی افواج کے فوجی مشنریوں کی طرح یہ جہادی جنگجو اس مذہبی ڈرامہ میں مصروف ہیں جو کائناتی سطح پر جاری ہے۔ ان کے ساتھ مذاکرات نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ انہیں وہ کچھ لینے کی تمنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا انہیں کچھ دے ہی نہیں سکتی۔ دراصل وہ دنیاوی فتح کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اسی لئے مسلم دنیا میں ان کے لئے پسندیدگی پائی جاتی ہے۔ مذہبیات کے سکالر بروس لارنس لکھتا ہے کہ ''ان کے ہاں پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اپنے مقصد کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے جسے مسلم دنیا میں بے حد سراہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب دنیا میں آج تک کوئی سیکولر تحریک اس کا مقابلہ نہیں کر سکی''۔

کائناتی جنگجو مسلمان فوجی اور شہری ٹھکانوں پر، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خلاف اپنے حملوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بن لادن اسے دو کیمپوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جو ایمان والے ہیں اور دوسرے وہ جو کافر ہیں۔ وہ عورتوں اور بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کے قتل کو تکفیر کے نظریے کے تحت جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ ان بچے کھچے طالبان میں سے ہیں جو پاکستان اور افغانستان کے قبائلی علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ طالبان کی طرح ان کے کوئی قومی مفادات نہیں۔ ان کا جہاد قابض قوت کے خلاف دفاعی جدوجہد نہیں بلکہ اس کی بنیاد ابدی کائناتی جنگ ہے جو دنیاوی خواہشوں سے ماوراء ہے۔ ظواہری نے اعلان کیا تھا کہ ''خدا کی راہ میں جہاد سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ نہ انسان اور نہ ہی کوئی تنظیم۔ یہ سچ اور جھوٹ کے درمیان جدوجہد ہے اور یہ تب تک جاری رہے گی جب تک پوری زمین اور زمین پر رہنے والوں پر خدا کا حکم نافذ نہیں ہو جاتا۔ طالبان کمانڈر ملا محمد عمر اور شیخ اسامہ بن لادن، خدا انہیں ہر بدی سے بچائے، جہاد کی راہ میں اسلام کے محض دو سپاہی ہیں اور یہ کہ سچ اور جھوٹ کے درمیان جدوجہد وقت سے ماوراء ضرور ہوگی''۔

امریکی فوج کو القاعدہ کے کائناتی جنگجوؤں کو ختم کرنے اور انہیں قتل کرنے میں کافی حد تک

کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ درحقیقت ایک عالمی مجرمانہ سازش کے طور پر القاعدہ کو اپنے وجود کے بحران کا سامنا ہے۔ اس کا بنیای ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ اس کے رضا کار اور عہدیدار ختم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ کچھ مقامات پر القاعدہ کسی حد تک کارروائیاں کر رہی ہے اور پوری دنیا میں کہیں کہیں وہ حملے کر کے تباہی مچا رہے ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تنظیم پہلے جیسی فعال ہے۔ تاہم وہ اپنے وجود کو ثابت کرنے کیلئے تشدد کی کارروائیاں کرتے ہیں لیکن اب ان کے پاس وہ قوت نہیں رہی جو ۹ نومبر کے واقعات سے پہلے تھی۔ تب سے ان کی کامیابیاں محض خیالی ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ کسی ملک کو اپنے قبضے میں نہیں لے سکے۔ عراق کے سنی باغی جو کبھی القاعدہ کے ساتھ تھے، اب اس تنظیم سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کر چکے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ جنگ کے اسلامی اصولوں سے ان کا انحراف ہے۔ اس گروپ کی کمان میں اب عالمی سطح پر خلافت کا قیام محض ایک لطیفہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب وہ عالمی سطح پر مسلمانوں کو بغاوت پر اکسانے کے لائق نہیں رہ گئے اور یہ تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب انہوں نے اپنا مدار ''قریبی دشمن'' سے ''دور کے دشمن'' میں تبدیل کر دیا۔ اس کے برعکس پوری مسلمان دنیا میں مسلسل انتخابی عمل نے یہ واضح کر دیا کہ تمام طبقات، ہر عمر اور سماج کے ہر شعبہ نے القاعدہ کے اقدامات کو مسترد کر دیا ہے۔ ایک مقبول جہادی ویب سائٹ پر یہ پیغام دنیا بھر میں پڑھا گیا کہ ''مسٹر ظواہری وہ کون ہیں جو آپ کی مرضی سے بغداد، مراکش اور الجزائر میں معصوموں کو قتل کر رہے ہیں؟''

القاعدہ کی طرف سے معصوم شہریوں کے قتل اور تکفیر کے بے محابہ استعمال نے ظواہری کے ساتھی جہادیوں کو بھی اس کے خلاف کر دیا۔ ظواہری گروپ سے عدم اتفاق کرنے والوں کو قتل کر دینے کے عمل نے اس کے اپنے ساتھیوں میں نفرت پیدا کر دی۔ ۲۰۰۸ء میں تکفیر والحجرہ اور افغانستان میں جہادی کیمپوں میں تکفیر کے نظریہ کو عام کرنے والے ڈاکٹر فضل نے ایک کتاب تحریر کی جس میں القاعدہ اور اس کے رہنماؤں کی مذمت کی گئی۔ سعودی روزنامہ الحیات کے ایک رپورٹر کو ڈاکٹر فضل نے بتایا کہ ''ظواہری اور بن لادن انتہائی بے ایمان، فاجر اور بدکردار افراد ہیں۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ نوجوان ان دونوں سے ہوشیار رہیں اس لئے کہ یہ دونوں، نوجوانوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں لیکن نوجوان ان دونوں کے کردار سے واقف نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر فضل کے اس بیان سے القاعدہ کو بے حد نقصان پہنچا۔ چنانچہ ایمن ظواہری

مجبور ہو گیا اور اس نے اپنے سابق استاد کی تردید میں دو سو صفحے کی کتاب لکھ ماری۔

اگرچہ امریکہ اور اس کے حامیوں نے القاعد کی کارروائیوں کو روکنے اور اس کے ٹھکانوں کو تباہ کرنے میں فوجی کامیابی حاصل کی لیکن سماجی تحریک جہادازم کو پھیلنے سے روکنے میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یاد رہے کہ القاعدہ جہادازم کا محض عسکری بازو ہے بقول عبد اللہ عظام حقیقت یہ ہے کہ القاعدہ ایک وجود کی بجائے زیادہ تر ایک فکری نظام کا نام ہے یہ تحرک کا ذریعہ ہے''۔

ابو مصعب الصوری نے اعلان کیا کہ ''یہ کوئی گروہ نہیں اور نہ ہی ہم اسے گروہ کی شکل دینا چاہتے ہیں۔ یہ تو ایک بلاوا ہے، ایک حوالہ ہے، ایک طریقہ کار ہے''۔ اگرچہ لفظ ''القاعدہ'' کو انگریزی میں ''دی بیس'' (بنیاد) لکھا جاتا ہے، جس کا مطب ہے مضبوط اور قابل فتح، اور ایسی چیز جس کا تحفظ کیا جاسکتا ہے یا جس پر حملہ آور ہوا جاسکتا ہے۔ ویسے القاعدہ کا اصل مطلب ''دی رولز'' (اصول) یا فنڈامینٹلز (بنیادی اصول) ہے عربی مقررین اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے حوالے سے استعمال کرتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو پھر القاعدہ کو اسلامی بنیاد پرستی کی ایک شکل کے طور پر دیکھنا ہوگا جس کا مطلب ہے مذہب کے بنیادی نظریات پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونا۔ لیکن القاعدہ کو عالمی جہاد کا عملی مقام قرار دینا خطرناک ہوگا بلاشبہ بین القومی سماجی تحریک کے طور پر جہادازم کو عمل کرنے والا ادارہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

القاعدہ کے لئے عراق اور افغانستان کی جنگیں، بقول بن لادن، تیسری عالمی جنگ کے مرکزی محاذ بن چکے ہیں۔ جس کا آغاز صلیبی صیہونی اتحاد نے اسلامی قوم کے خلاف کیا۔ ان جنگوں نے جہادی نظریہ سازوں کو بے بہا تازہ دم ریکروٹنگ ہتھیار (افرادی قوت) مہیا کے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے فلسطین پر قبضہ کے بعد ہر جگہ سے تحریک میں نوجوان شامل ہوئے اور یہ وہ نوجوان ہیں جن کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان ملکوں سے ہے۔ یہ بین القومی شناخت کے طور پر سامنے آئی ہے جس کا ایک زبان، ایک نسل یا ایک ثقافت سے تعلق نہیں۔ جبکہ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے مقامی یا بین الاقوامی حالات کی بنا پر حقیقی یا غیر حقیقی معاملات کی وجہ سے یکجا ہو کر مغرب کے ہاتھوں ہونے والی ناانصافی کا خاتمہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر نوجوان ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے اور جو سیاسی

طور پر متحرک اور سماجی شعور رکھنے والے مسلمان ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ القاعدہ کو مسلم دنیا کی واحد ایسی طاقت سمجھتے ہوں جو ان کی تکالیف کے ازالے کیلئے راہ پیدا کرے گی لیکن وہ ہتھیار اٹھا کر جہاد کرنے کے زیادہ حامی نہیں۔ بہرحال انسانی طمع اور لالچ کے پیش نظر انہیں سبز باغ دکھا کر عملی طور پر اس جنگ کا حصہ بنالیا جاتا ہے۔

القاعدہ جیسے جنگجو گروپوں کی طرف سے دہشت گردی کے خطرے کو مکمل طور پر ختم کیا جانا ممکن نہیں۔ جیسا کہ عالمی کریمنل سازش میں ہوتا ہے، فوجی، انٹیلی جنس اور سفارتی ذرائع کے استعمال سے برسوں بعد ہوسکتا ہے کہ اس عفریت پر قابو پایا جاسکے لیکن اسامہ بن لادن اور ایمن ظواہری نے برسوں پہلے جس سماجی تحریک کا آغاز کیا تھا اس کو ختم کرنے کیلئے فوجی قوت کے استعمال سے زیادہ کسی اور طریقے کی ضرورت ہوگی۔ اس مقصد میں کامیابی کے لئے ان سماجی، سیاسی اور اقتصادی قوتوں کو گہرائی میں جا کر سمجھنا ہوگا جن کی وجہ سے عالمی جہاد ازم نہ صرف پیدا ہوا بلکہ اسے نوجوان مسلمانوں میں بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا مطلب چاہے کچھ ہو، یہ ایک نظریاتی جنگ ہے جو نہ صرف بغداد کی گلیوں اور افغانستان کے پہاڑوں پر لڑی جائے گی بلکہ یہ جنگ پریس، مشرقی لندن کے غربت زدہ علاقوں، برلن اور نیویارک کے بڑے بڑے شہروں میں بھی لڑی جائے گی۔ یہ جنگ انسانوں کے خلاف بندوقوں کی جنگ نہیں ہوگی بلکہ کمپیوٹروں پر بیٹھنے والے لڑکوں کے خلاف لڑی جائے گی۔ یہ وہ جنگ ہوگی جو گولیوں اور بموں سے نہیں جیتی جاسکے گی بلکہ لفظوں اور تصورات کے ذریعے سے جیتی جاسکے گی۔

☆☆☆

حصہ سوم

جنگ کا خاتمہ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں

باب ششم

جنریشن ای (Generation E)

پورے یورپ میں ہیتھرو جیسا حواس باختہ ہوائی اڈہ اور کوئی نہیں۔ اس کے پانچ بڑے ٹرمینل مغربی لندن کی گرین بیلٹ کے ساتھ ساتھ میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہاں پر دنیا بھر کے ہوائی اڈوں سے کہیں زیادہ پروازیں آتی اور جاتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہیتھرو ہوائی سفر کا محور ہے۔ ہیتھرو ہوائی اڈے کی بجائے ایک بہت بڑے شہر جیسا گاؤں ہے۔ جہاں آپ کو بھانت بھانت کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہوئے ملیں گے جو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کیلئے کہنیاں مار کر اپنا راستہ بناتے ہیں۔

میں فجر کے وقت ہیتھرو پہنچتا ہوں۔ میرے ذہن پر ویسی ہی شدید دھند چھائی ہوئی ہے جیسی باہر رن وے پر چھائی ہوئی نظر آئی۔ جہاز سے اترنے کے بعد مجھے کوئی امیگریشن آفیسر نہیں ملتا اس لئے میں دوسرے مسافروں کی طرح دھکے کھاتا ہوا ٹرمینل ۳ پر پہنچ جاتا ہوں۔ باہر تھوڑے فاصلے پر ہم میں سے کئی ان ٹرمینلوں کی طرف مڑ جاتے ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور آخر کار ہم پاسپورٹ کنٹرول آفس پہنچ جاتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزید گلوبلائزیشن نے کس طرح ہماری سرحدوں کو ختم کر دیا ہے۔ یہاں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان سرحدوں کا انتظام وانصرام کس قدر نمائشی بن چکا ہے۔ پیچ دار قطاریں، سخت چہروں والے افسر، مسافروں کو سونگھنے والے کتے، رنگ دار نشانات، دوکانیں، یہ سب لوگوں کو اپنی گھات میں پھنساتے مسافروں کو بھیڑوں کی طرح آگے کی طرف دھکیلتے نظر

آتے ہیں۔ یہ سب کچھ سیکورٹی کے نام پر ہوتا ہے۔ بہرحال حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ کنٹرول کا مسئلہ بھی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں سرحدیں تیزی کے ساتھ غیر متعلق ہوتی جارہی ہوں یہ جان کر کچھ سکون حاصل ہوتا ہے کہ تیزی کے ساتھ ختم ہوتی ہوئی ہماری علاقائی سرحدوں کے اختتام پر ایک ایسی ریاست ابھی موجود ہے جو معاملات کو قابو میں رکھنے کے اقدامات کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شناخت پر کنٹرول نہ ہوسکتا ہو لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ریاست کس کو اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے اور کس کو روک لیتی ہے۔

ہیتھرو اور بعض دوسرے ہوائی اڈوں میں فرق ہے۔ اوپر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ مسافروں کیلئے دو مختلف راستے بنے ہیں۔ ایک میرے جیسے مہمانوں کے لئے ہے اور ہمیں صبر کے ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی لمبی قطار میں کھڑے رہ کر انتظار کرنا پڑتا ہے تاکہ ہماری شناخت صحیح طریقے سے ہو سکے اور ''برطانوی حکومت کے مہمانوں'' کے طور پر پہچانے جاسکیں۔ دوسرا راستہ چمکدار نیلے مربع پر سنہری ستاروں کے ایک دائرے کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے اور یہ راستہ صرف برطانوی شہریوں کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام یورپی یونین کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ جو یہ راستہ اختیار کرتے ہیں ان کا تعلق فرانس، سپین، جرمنی، ہالینڈ، لٹویا، سویڈن، رومانیہ، مالٹا سے ہی نہیں بلکہ ستائیس علیحدہ علیحدہ قوموں میں سے کسی بھی قوم سے ہوسکتا ہے۔ ان ملکوں کے لوگوں کے لئے یورپ کے کسی بھی ملک جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ اپنے ہمسائے کے گھر جاتے ہیں

یورپی باشندوں کے لئے آنے جانے کی آزادی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یورپ کے لوگ ایک دوسرے کی سرزمین پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کی زبانیں سمجھتے اور بولتے ہیں، ایک دوسرے کے کھانوں سے شناسا ہیں اور صدیوں سے ایک دوسرے کی ثقافتوں کے حصے دار ہیں۔ لیکن یورپی یونین کے قیام نے ان ریاستوں کو جنہوں نے صرف ساٹھ سال پہلے اس خطے کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا، ''متحدہ ریاستہائے یورپ'' میں تبدیل کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ ونسٹن چرچل کا خواب یہی تھا جو یورپی یونین کے قیام کے ساتھ پورا ہو گیا۔

یورپی یونین ایک ایسی غیر معمولی اور بے نظیر جیو پولیٹکل صف بندی ہے جو رومن ایمپائر کے خاتمے کے بعد دوبارہ سامنے آئی ہے۔ کس قدر خوبی کی بات ہے کہ ایسی آزاد ریاستوں کا

ایک گروپ جو محض جغرافیائی طور پر اکٹھی ہوں، آپس میں مشترکہ آئین اور ایک مشترکہ عدلیہ، ایک کرنسی اور مشترکہ منڈی، ایک پارلیمنٹ، ایک پاسپورٹ، ایک پیدائشی سرٹیفکیٹ، ایک شہریت اور ایک کمیونٹی کی بنیاد پر متفق ہیں۔ کیا یہ عجوبہ نہیں کہ ستائیس آزاد ریاستیں جن میں تیئیس زبانیں بولی جاتی ہوں اور جن کی آبادی پچاس کروڑ افراد پر مشتمل ہو، یکجا ہو جائیں۔ ایک ایسا براعظم وجود میں آجائے جس کی سرحدیں ہی نہ ہوں۔

گلوبلائزیشن کے پرجوش حامیوں کے لئے پوری یونین یورپی قوموں کے ایک دوسرے پر انحصار کے مستقبل کی ایک جھلک ہے۔ اس کی تخلیق استثناء کی سیاست کی نفی کرتی ہے۔ پچھلی صدی کے دوران اس خطے میں ایک دوسرے سے الگ رہنے یا ایک دوسرے کو مسترد کر دینے کی سیاست کا راج رہا ہے۔ یورپ کی ایک نئی، سرحدوں کے بغیر نسل، جسے مصنف ٹی آر ریڈ جنریشن ای کا نام دیتا ہے، خود کو اسپینی یا چیک نہیں کہلاتی، بلکہ خود کو یورپین کہلانا پسند کرتی ہے، اس کے نزدیک یورپی یونین عالمی امن اور خوشحالی کی علامت ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب قومی ریاستیں مل کر دوستی کو فروغ دیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور مشترکہ مفادات کو فروغ دیں۔

گلوبلائزیشن کے نقادوں کے نزدیک یورپی یونین بے قابو نظام سرمایہ داری، ثقافتی کمزوری اور آخر کار قومی شناخت کی گمشدگی کا ڈراؤنا خواب ہے۔ گذشتہ دہائی کے دوران یورپی یونین کے رکن ممالک نے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے کے لئے مختلف معاہدے کئے جن کا مقصد ایک وفاقی نظام کا قیام ہے (اور مزید ملکوں کو اس میں شامل کرنا) اس کی وجہ سے یورپ بھر میں ایک دوسرے سے خوف اور شدید قوم پرستی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اسی وجہ سے نسل پرست دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کو انتخابات میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ فرانس میں فرنچ نیشنل فرنٹ، برٹش نیشنل پارٹی اور فریڈم پارٹی آف آسٹریا کامیاب رہی ہیں۔ اس کے علاوہ فرانس کے ژاں میری لوپن، نیدرلینڈ میں گریٹ وائلڈرز یا آسٹریا کے آنجہانی جارج ہائیڈر جیسے نئے فاشسٹ رہنماؤں کو زبردست پذیرائی ملی۔

ان سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کی مقبولیت کی وجہ متعدد یورپی لوگوں میں پھیلا ہوا وہ خوف ہے جو گلوبلائزیشن اور اس کے نتائج کے حوالے سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کو خوف ہے کہ گلوبلائزیشن کی وجہ سے ان کی قومی آزادی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ طاقت کے نئے روپ

سامنے آ جائیں گے۔ انجانی نوکر شاہی اور نئے اور غیر جانے پہچانے چہرے ان کے ثقافتی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔ اس وہم اور تشکیک نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں تک کہ جیز یشن ای بھی اس کے اثرات سے نہ بچ سکی۔ ۲۰۰۵ء میں فرانس اور نیدرلینڈ نے یورپی یونین کے آئینی مسودے کو بھاری اکثریتی ووٹوں سے مسترد کر دیا حالانکہ یہ دونوں ممالک یورپی یونین کے قیام کی بنیادی داعی ریاستوں میں سے تھے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ اسی برس فرانس کے ان علاقوں میں خونی فسادات شروع ہو گئے جہاں مختلف النسل تارکین وطن آباد ہیں اور ان فسادات نے پیرس کی نواحی آبادیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس سے ایک برس پہلے مراکش سے آنے والے ایک تارک وطن محمد بوئری نے ایک متنازعہ فلمساز اور اشتعال پیدا کرنے والے پیشہ ور تھیو وان گوہ کو ایمسٹرڈم کی گلیوں میں قتل کر دیا تھا۔ ایمسٹرڈم وہ شہر ہے جس کی آدھی آبادی غیر ملکیوں پر مشتمل ہے۔ ان دو واقعات کے بعد ہالینڈ کے اخبار میں حضرت محمد صلعم کے کارٹونوں کی اشاعت نے یورپ کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں فسادات اور مظاہرے برپا کر دیئے۔ ان کارٹونوں کو روکنے کی بجائے یورپ بھر کے اخبارات اور رسائل نے شائع کیا جس کا مقصد اس ڈچ یا ڈینش اخبار کے ساتھ اتحاد کو واضح کرنا تھا۔ اس واقعہ نے یورپ بھر میں ایک نئی بحث کو جنم دیا جس نے لوگوں کے ذہنوں میں موجود اس شک کو تقویت دی کہ یورپی یونین کے قیام کا مقصد یورپی ممالک کے درمیان سرحدوں کا مکمل خاتمہ ہے۔ اس صورتحال نے ان شدت پسند قوم پرستوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ لسانی اور ثقافتی یک رنگی کے محافظ صرف وہی ہیں۔ اور وہی قوم پرستی کی ایسی قوت ہیں جو ان وحشی گروہوں کا سامنا کر سکتی ہے جو گلوبلائزیشن کی بلند ہوتی ہوئی لہروں سے یورپ کے ساحلوں کو بہالے جانا چاہتے ہیں۔

آج کے یورپ میں جب وحشی گروہوں کی بات ہوتی ہے تو اس سے مراد مسلمان ہوتی ہے۔ دراصل گذشتہ نصف صدی کے دوران مسلمانوں کی بھاری اکثریت میں یورپ میں آمد اس صورتحال کی وجہ ہے۔ اس صورتحال نے یورپ کی قوموں کو شناخت کے بحران سے دوچار کر دیا ہے اور اس شناختی بحران کو اسلام کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ سمجھا یہ جا رہا ہے کہ اب یہودیوں کی جگہ مسلمان یورپ کے نئے نیگٹیو پول (Negative Pole) بن چکے ہیں۔

حقیقت میں اسلام نے یورپ کے دوسرے اصلی جوہر کا اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج جس

یورپ کو ہم جانتے ہیں، اس کی زیادہ تر سرحدیں اسلام کے ساتھ براعظم کی وہ جنگیں ہیں جو صلیبی جنگوں سے شروع ہو کر ہاپس برگ ایمپائر کو ترکوں کی یلغار سے بچانے کیلئے لڑی گئیں۔ لیکن یورپ کی سرحدوں کو اکھاڑنے کے عمل نے حقیقی اعتدال اور توازن کو بدل کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے اسلام کے ساتھ یورپ کے تکلیف دہ تعلق کو الگ کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ سالمیت اور قومی شناخت کے وہ بڑے سوالات ہیں جو گلوبلائزیشن کے براہ راست نتیجے کے طور پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانس کے سکولوں میں مسلمان بچوں کو حلال گوشت مہیا کرنے سے انکار نے، بقول اولیویئر رائے، فرانسیسیوں کے لئے ایسا مسئلہ بنا دیا ہے جیسے ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنا ہو۔ اس کا مطلب ہے محض سیاسی شناخت پر اصرار کے ذریعے قومی یک رنگی کو مسلط کرنا اور یہ سیاسی شناخت مخصوص مذہبی یا ثقافتی شناختیں ہوتی ہیں۔ جرمنی میں نئی مساجد کی تعمیر کو سیاسی اور شہری رہنماؤں نے روک دیا ہے۔ ان رہنماؤں کی دلیل یہ ہے کہ عمارتیں عبادت گاہیں نہیں ہوتیں بلکہ ''متوازی دنیا کی علامتیں'' ہوتی ہیں۔ نیدرلینڈ نے قرآن پر پابندی کا قانون متعارف کروایا ہے جسے چند سیاسی رہنما ''ڈچ اقدار'' کے منافی قرار دیتے ہیں۔ برطانیہ میں سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر نے مسلم پردہ کی مذمت کی جبکہ برقع پہننے والی خواتین نے برطانوی وزیراعظم کے اس بیان کو اپنی آزادی کے خلاف قرار دے دیا تھا۔ اس سے کسی کو غرض نہیں کہ برطانیہ میں صرف تین فیصد مسلمان عورتیں برقع پہنتی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ برقع ہو یا مسجد یا مسلم خوراک، یہ سب کچھ بلاشبہ اسلام کے دوسرے رخ کی علامتیں ہیں جس نے یورپی قومی شناخت کے مسئلہ کو ایک بار پھر سے شدت کے ساتھ جنم دیا ہے۔ آپ کو بڑی مگر نسلی طور پر تنہائی کی شکار قومیتوں کے علاقے پورے یورپ میں ملیں گے۔ مثال کے طور پر جنوبی لیڈز میں آپ کو برطانوی ورکنگ کلاس کا علاقہ بیسٹن ملے گا۔ جو ہیتھرو سے دو سو میل شمال میں واقع ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ یورپ میں اسلام کا خوف اور گلوبلائزیشن کا خوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

بیسٹن کسی زمانے میں ایک خوشحال اور ترقی کرتا ہوا صنعتی شہر تھا لیکن اس کی زیادہ تر فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں۔ اس کے جلے ہوئے راکھ کے ڈھیر شہر بھر میں پھیلے ہوئے اور میناروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ شہر دو علاقوں میں منقسم ہے۔ بیسٹن ولیج کی آبادی متوسط طبقے پر مشتمل ہے

جہاں وکٹورین سٹائل کے گھر اور نئے شاپنگ سنٹر قائم ہیں جبکہ اس کے برابر میں بیسٹن ہل کا علاقہ ہے جو شہر کے مشرق میں واقع ہے اور جس کی آبادی غریبوں پر مشتمل ہے۔ اب یہاں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے جو غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

بیسٹن ہل میں دن کے کسی بھی وقت آپ کو بیروزگار نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ملے گی یہ پاکستانی ہیں جو خود یہاں آئے یا ان کے والدین یہاں آ کر آباد ہوئے۔ وہ گلیوں میں سگریٹ پیتے آوارہ گھومتے رہتے ہیں۔ بیسٹن میں ملازمتیں ہیں، مجھے یہاں کے ایک نوجوان نے مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔ ''کال سنٹرز میں ملازمتیں ہیں''۔ لیکن یہاں کے لڑکے زیادہ تر اپنی خاندانی دوکانوں میں کام کرتے ہیں جہاں سے اتنے پیسے کما لیتے ہیں جن سے ان کی سگریٹوں اور چپس کا خرچہ نکل آتا ہے اور جب وہ بیس برس کے ہو جاتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی کل مالیت سگریٹ اور چپس ہیں اور پھر وہ یا تو نشہ آور منشیات پر لگ جاتے ہیں یا پھر اسلام کی طرف رخ موڑ لیتے ہیں۔

بیسٹن ہل میں رہنے والے خاندان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ یہ علاقہ گنجان آباد ہے۔ ان میں سرخ اینٹوں والے بدحال مکانات گھوڑے کی نعل سے مشابہ ہیں جن کے درمیان میں جنگلی گھاس کا چھوٹا سا باغیچہ ہوتا ہے جس کے اردگرد باڑھ لگائی ہوتی ہے۔ ہر گھر کی بالکونی پر سیٹلائٹ ڈشز لگی ہوتی ہیں۔ ایک ایک گھر میں تین تین پاکستانی خاندان رہائش پذیر ہوتے ہیں جو آپس میں قریبی عزیز ہوتے ہیں اور ایک ہی پاکستانی گاؤں سے اٹھ کر یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ یہ خاندان گھر کے باہری حصے میں سفید رنگ کی پرانی چادریں لٹکا کر گھر کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ بوڑھے باریش مرد سلیپر اور شلوار قمیض پہنے ان گھروں سے نکلتے ہیں اور واپس آتے ہیں۔ یہ بزرگ لوگ ہر دوسرے نوجوان کے چچا، تایا یا ماموں ہوتے ہیں۔ یہاں کمیونٹی کا حکم چلتا ہے۔

خود برطانوی حکومت کا یہ ماننا ہے کہ بیسٹن ہل میں رہنے والے لوگوں کا پست معیار زندگی پورے برطانیہ میں کہیں اور نہیں مل سکتا۔ یہاں انتہائی درجے کی غربت ہے، منشیات کا کاروبار عروج پر ہے اور نشہ آور ادویات آپ کو ہر دوسرے گھر سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ نسلی امتیاز کا بھدا ترین چہرہ آپ کو بیسٹن ہل میں مل سکتا ہے۔

اسلام! برطانیہ سے نکلو! یہ الفاظ آپ کو مقامی شراب خانوں کی دیواروں پر لکھے ملیں گے۔ یہ پڑھ کر یقیناً آپ کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان الفاظ کا کیا مطلب لوں۔ پھر میرے ایک دوست نے مجھے سمجھایا کہ یہ وہ نعرہ ہے جو ایک پمفلٹ کا عنوان تھا جسے دائیں بازو کی برٹش نیشنل پارٹی نے شائع کر کے بڑے پیمانے پر تقسیم کروایا تھا۔ برٹش نیشنل پارٹی برسوں سے برطانیہ میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کے خلاف تحریک چلا رہی ہے۔ لیکن نو نومبر کے واقعہ کے بعد سے اس پارٹی کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ برطانیہ کے اندر اور باہر مسلمانوں کے ہوائی سفر پر پابندی عائد کی جائے۔ اس کے علاوہ اس جماعت کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ اس تمام کاروبار کا بائیکاٹ کیا جائے جن کے مالک مسلمان ہیں (وہ چینیوں اور ہندوؤں کے کاروبار کے بائیکاٹ کا ذکر نہیں کرتی بلکہ صرف مسلمانوں کے کاروبار کے بائیکاٹ کا مطالبہ کرتی ہے)۔ برٹش نیشنل پارٹی کے اس مطالبے کو اچانک برطانیہ میں پذیرائی ملنی شروع ہوگئی ہے۔ سکائی نیوز نے ۲۰۰۶ء میں ایک پول کرایا جس سے معلوم ہوا کہ برطانیہ کے ساٹھ فیصد شہری چاہتے ہیں کہ برطانیہ میں مزید تارکین وطن کو داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔ وہ پارٹی جسے ۱۹۹۰ء میں پوری پارلیمنٹ نے نازی ازم کا پرچار کرنے والی پارٹی قرار دے دیا تھا، آج برطانوی سیاست کی جائز قوت بن گئی ہے چنانچہ اس نے ۲۰۰۶ء میں دوگنی سے زیادہ کونسل کی نشستیں جیت لیں۔ پہلے اس کی بیس نشستیں تھیں لیکن ۲۰۰۶ء میں اس کی نشستوں کی تعداد چھیالیس ہوگئی۔ ۲۰۰۸ء تک اس کی نشستوں کی تعداد ایک سو تک ہوگئی۔

برٹش نیشنل پارٹی کے عروج کا زمانہ وہی ہے جب پورے برطانیہ میں یورپی یونین کے خلاف نفرت اپنی انتہا کو پہنچی۔ برٹش نیشنل پارٹی نے اس وقت طاقت پکڑی جب یورپی یونین کے بارے میں شکوک وشبہات عام ہوگئے۔ گلوبلائزیشن کے بارے میں برطانوی خوف سے سب سے زیادہ فائدہ برٹش نیشنل پارٹی کو پہنچا۔ (بی این پی کی ویب سائٹ پر یورپی یونین کے پرچم پر ستاروں کے دائرے کے اندر سنہرے رنگ میں سواستیکا کا نشان بنایا گیا ہے)۔ اس عرصے میں جو انتخابات ہوئے تو ''مسلم مسئلے'' کے حوالے سے پارٹی کے منفی رویے کو زبردست پذیرائی ملی اور بڑے پیمانے پر پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔

بارش کی پھوار میں اپنے دوست کے ساتھ کھڑے ہو کر پب (شراب خانے) کی دیوار پر

لکھے ہوئے الفاظ کو میں نے پڑھا۔ان لفظوں سے غصہ اور نفرت جھلکتے تھے۔مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ پہلا موقعہ نہیں تھا جب میں نے برٹش نیشنل پارٹی کے پراپیگنڈے کا سامنا کیا ہو۔۲ جولائی ۲۰۰۵ء کو یعنی لندن کی زیرزمین چلنے والی ٹرین اور بس ٹرمینل پر جہادیوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کے صرف پانچ دن بعد بی این پی کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ پورے ملک میں تقسیم کئے گئے جن میں بس نمبر ۳۰ کے جلے ہوئے ڈھانچے کی تصویر شائع کی گئی تھی۔اس بس کو ۷/۷ بمباروں کے کم عمر ترین حسیب حسین نے خودکش حملے میں تباہ کیا تھا۔ پمفلٹ کے نچلے حصے پر یہ پیغام لکھا ہوا تھا کہ ''بی این پی کی بات سننے اور ماننے کا وقت آن پہنچا ہے''۔

حسیب حسن اپنے خودکش حملہ آور ساتھیوں محمد صدیق خان اور شہزاد تنویر کی طرح ویسٹ یارک شائر میں پیدا ہوا تھا اور بیسٹن کی بڑی مسلم کمیونٹی میں پلا بڑھا تھا۔ چوتھا خودکش حملہ آور جرمین لنڈ سے نومسلم تھا اور حال ہی میں جمیکا سے یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔حسیب حسین چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے لوگ آپس میں عزیز رشتہ دار تھے لیکن یہ خاندان کوئی سخت قسم کا مذہبی نہیں تھا۔اس کے ماں اور باپ (دونوں برطانوی شہری تھے) اس کا بھابی اور اس کی بھائی ہالیبک ڈسٹرکٹ میں چار بیڈ رومز والے آرام دہ گھر میں رہائش رکھتے تھے۔اس کے خاندان کے باقی لوگ بھی اس کے گھر کے آس پاس ہی رہائش پذیر تھے۔

حسیب حسین کا خاندان بیسٹن کے معیار سے غریب نہیں تھا۔حسیب کا والد ایک فیکٹری کا باقاعدہ ملازم تھا۔اس کا بھائی لیڈز میں کامیاب ایڈمنسٹریٹر تھا۔حسیب کوئی زیادہ ذہین لڑکا نہیں تھا۔نہ تو وہ سرگرم تھا اور نہ ہی عینیت پسند تھا۔ ہر لحاظ سے وہ ایک معمولی قسم کا نوجوان تھا اسی لئے اس کے دوست، خاندان کے لوگ اور خود برطانوی حکام بھی اس کے اندر آنے والی تبدیلی پر سخت حیران تھے۔جیسا کہ ظاہر ہوا کہ برطانیہ میں مقیم دوسری پاکستانی نسل پہلی جہادی نسل میں تبدیل ہو چکی تھی۔نوجوان حیب حسین کے ایک شرمیلے لڑکے سے خودکش حملہ آور میں تبدیل ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسل عالمی جہاد کے عمل کو ایک سماجی تحریک کے حوالے سے دیکھتی ہے۔

پہلے سماجی تحریکوں اور نئی نسل کے رویوں کو تبدیل کرنے میں مذہب کے کردار پر بات کرنا ضروری ہے۔سماجی تحریکیں اس وقت مضبوط ہوتی ہیں جب بے اختیار لوگ ایک مشترکہ شناخت

کے پرچم تلے اکٹھے ہو کر موجود سماجی ڈھانچے کو چیلنج کرتے ہیں۔ اپنے کردار کے حوالے سے ایسی تحریکیں عموماً خیالی ہوتی ہیں اور وہ سماج کو نئی نظر سے دیکھتی ہیں۔ یہ بات خصوصاً ان سماجی تحریکوں کے بارے میں صحیح ہے جو سماج کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھتی ہیں اس کی سب سے بڑی مثال گلوبل جہادازم کی ہے جو متشدد انقلاب کے ذریعے پرانے سماجی ڈھانچے کو مکمل طور پر ختم کرنے کی خواہش کرتی ہے اور جو آخر کار عالمی انقلاب پر منتج ہو۔

سماجی تحریکیں کوئی آج کا معاملہ نہیں ہے جس کا اظہار ''پرشوق'' کے ارکان نے کیا ہے۔ نہ تو یہ سیکولر ہوتی ہیں جس کی مثال ایوینجیکل موومنٹ ہے۔ تاہم جدید زمانے میں سماجی تحریکوں کے ارکان کو یہ حوصلہ ملا کہ وہ انسانی سماج کو نئی شکل دینے کے بارے میں سوچیں۔ جدیدیت ایک ایسی اصطلاح ہے جس سے فریب کھایا جا سکتا ہے۔ سادے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جدیدیت ایک فریب کن اصطلاح ہے۔ اس کے ساتھ جو تصورات جڑے ہوئے ہیں ان میں سرفہرست بڑے شہروں کی تخلیق اور تیز رفتار صنعتکاری ہیں اس لئے کہ سماج جاگیرداری نظام سے سرمایہ دارانہ نظام میں داخل ہو چکا ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ جدید زمانے کی خصوصیت انسانی شعور میں اچانک تبدیلی ہے اور وہ تب ہوا جب لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سماج کے قواعد اور قدریں ہمیشہ ایک جیسی اور قطعی نہیں رہتیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جدت کے آنے کے ساتھ یہ اعتراف بھی سامنے آیا کہ سماج انسان کا بنایا ہوا ہوتا ہے جو انسان کی اکثریت کی سوچ کے تحت تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

جیسے جدیدیت نے سماج کے ساتھ افراد کے تعلق کو تبدیل کیا، ویسے ہی اس عمل نے انسانوں کو اپنے بارے میں جاننے کا راستہ بھی تبدیل کر دیا۔ پہلے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر شخص کی شناخت اس سماج سے ہوتی ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ لیکن جب یہ سوچ ابھر کر سامنے آئی کہ سماج تو انسانی تصور سے تشکیل پاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سماجی شناختوں کے بارے میں یہ تصور سامنے آیا کہ یہ بھی انسانی تخلیق ہی ہے۔ جب موجودہ سماجی نظام کے بہت سے متبادل موجود ہیں تو پھر ان شناختوں کے بھی بہت سے متبادل موجود ہوں گے جن کو سماج ہم سے منسوب کرتا ہے۔ یوں جدیدیت کے عروج کے ساتھ ہی نئی مشترکہ شناختیں بھی سامنے آنے لگیں۔ جو معاشرتی بندھنوں کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی ذات کے شعور کے ذریعے سے وجود میں آئیں۔ ''میں کون ہوں، مجھے

بتانے والے تم کون ہو؟'' کی جگہ ''میں کون ہوں؟ میں بتاؤں گا'' نے لے لی ہے۔ مختصراً یہ کہ نئے زمانے نے بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب ایسا نہیں کہ کوئی دنیا پر اپنی بتائی ہوئی شناخت ٹھونسے گا۔ نئی تبدیلی کے تحت ہر کوئی اپنی شناخت خود بنائے گا۔

اس تبدیلی کا آغاز انیسویں صدی کی ابتداء میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی بار طے شدہ سماجی ڈھانچے کو مربوط اور منظم چیلنجوں کا سامنا ہوا۔ خاص طور پر انقلاب فرانس (۱۷۹۹۔۱۷۷۸) کے ''آزادی، بھائی بندی اور مساوات'' کے نعروں ن نے انسانی سماج کے فرسودہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے اثرات صرف فرانس تک محدود نہیں رہے بلکہ پورے یورپ کو ان اثرات نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لوگ باگ شروع شروع میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں اکٹھے ہوئے اور دفاعی حیثیت میں کام کرتے رہے لیکن بعد میں یہ منظم ہو گئے اور سامنے کھڑے ہو کر مقابلے پر اتر آئے۔ آہستہ آہستہ سماجی تبدیلیوں کی اس بڑی تحریک نے پوری صنعتی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ افراد نہ صرف یہ کہ موجود سماجی ڈھانچے کو چیلنج کر رہے تھے بلکہ یہ اس کی بنیاد پر سوال اٹھانے لگے تھے۔ ''یہ دنیا ایسی کیوں رہے جیسی کہ اب ہے؟ یہ مختلف کیوں نہ ہو؟ اور ڈرامائی طور پر اس میں تبدیلی کیوں نہ آئے؟''

ان تصوراتی آدرشوں کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ سماجی سائنسدانوں نے ان سماجی تحریکوں کو بیزار لوگوں کی پناہ گاہ قرار دیدیا۔ پچھلی صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی کی بلیک پاور اور حقوق نسواں کی تحریکوں کو اور اب حال کی ماحولیاتی اور اینٹی گلوبلائزیشن کی تحریکوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور کہا گیا کہ ان تحریکوں کی عمر مختصر تر ہے، ان کی بنیادیں کھوکھلی ہیں اور یہ معاشرتی دباؤ کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی ہیں اور انہیں وہ لوگ چلا رہے ہیں جو معاشرے میں ہونے والی فطری تبدیلیوں سے واقفیت نہیں رکھتے اور یہ وہ لوگ ہیں جو سماج کو بھیڑوں کا گلہ سمجھتے ہیں۔

اس خیال یا تصور کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ ان سماجی تحریکوں کو درپیش تکالیف کو نظر انداز کرتا ہے۔ ماحول بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ گلوبلائزیشن دیسی یا علاقائی معیشتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ سیاہ فام، خواتین اور غربا عمومی طور پر طاقتوروں اور معاشرے کے برتر افراد کے ہاتھوں زخم کھاتے ہیں۔ بعض سماجی تحریکیں ان مسائل پر توجہ تو دیتی ہیں لیکن سیاست کے ذریعے یا قانونی اصلاحات کے ذریعے نہیں بلکہ مکمل معاشرتی تبدیلی (یا بین الاقوامی سماجی تحریک کے معاملے میں

جہاز ازم، عالمی تبدیلی) کو غیر منطقی اور لوگوں کی سوچ کے کے الٹ قرار نہیں دیا جا سکتا چاہے ان کے کئے گئے اقدامات معاشرے کی تسلیم شد قدروں کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسا کہ سوشیالوجسٹ مائیکل شوارٹز نے لکھا ہے کہ سماجی تحریکوں میں حصہ لینے والے اسی طرح صاحبِ عقل ہیں جس طرح ان تحریکوں کا مطالعہ کرنے والے سمجھدار ہیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں سماجی تحریکوں کے بارے میں موجود سوچ میں تبدیلی آئی۔ اور یہ نتیجہ ہے ان جائز ثقافتی مخالف چیلنجوں کا جو نسلی اور لسانی گروہوں، طلباء، ماحولیاتی گروہوں اور دوسرے گروہوں کی طرف سے درپیش تھے۔ یہ تمام گروہ ایک منظّم اور مشترکہ عمل کے ذریعے سماج میں وسیع بنیادوں پر ثقافتی، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ آج کی دنیا میں سماجی تحریکوں کو عالمی سطح پر منطقی طور پر تسلیم کرتے ہوئے رنجیدہ اور افسردہ گروپوں کی طرف سے منظّم سیاسی چیلنج کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود چند سوشیالوجسٹوں کی طرف سے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ ان تحریکوں کی تعریف یا خاصیت کو پھیلاتے ہوئے اس میں ان گروپوں کو بھی شامل قرار دے دیا جائے جو خود کو خصوصی طور پر مذہبی گروہ قرار دیتے ہیں اور یہ مذہبی گروہ بندی میں ملوث ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ سکالرز مذہب کے مطالعے کو ایک علیحدہ شعبہ سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں سیکولر نظریات کے زیرِ اثر سوشیالوجسٹوں نے اس تصور کو نظر انداز کئے رکھا۔ لیکن اس نئی صدی میں جبکہ دنیا بھر میں مذہب اور سیاست کے درمیان موجود حدیں تیزی کے ساتھ دھندلا رہی ہیں، ہم ان مذہبی تحریکوں کو ان افراد کے گروپوں سے الگ رکھ کر نہیں دیکھ سکتے جنہوں نے معاشرے کو چیلنج کرنے کے لئے اپنی انفرادی شناخت کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مذہب میں ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو سماجی تحریکوں کے عمل کو فروغ دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مذہب کسی بھی شخص کے اپنے ہونے کے احساس کو اجاگر کرتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جو تحریک کے ارکان کو شخصی سطح پر تحریک کی کامیابی میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذہب، سماجی تحریک کو انتظامی ڈھانچہ، مالی وسائل، کمیونیکیشن کے ذرائع اور افرادی قوت مہیا کرتا ہے جو تحریک کے عمل کو تیز تر کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ امریکہ میں شہری حقوق کی تحریک کی کامیابی کی بڑی وجہ اس تحریک کی وہ اہلیت ہے جس نے

اسے معلومات عام لوگوں تک پہنچانے کیلئے سیاہ فاموں کے گرجاؤں کے استعمال کو یقینی بنایا۔

سماجی تحریکیں شریک ہونے والوں کو یہ یقین دلاتی ہیں کہ تحریک میں شامل ہونے سے انہیں فائدہ ہوگا۔ جب معاملہ مذہب کا ہوتو پھر انہیں ترغیب دینا آسان کام ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لوگ جنت کے حصول کو دنیاوی مراعات پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے عقیدے کے لئے تمام دنیاوی آسائشوں کو قربان کرنے پر رضامند ہوجاتے ہیں۔ ہمیں ایک بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ لوگ جو مذہبی قیادت پر فائز ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے انہیں ان کے مذہبی اداروں کی طرف سے تسلیم نہ بھی کیا جائے، وہ ان اختیارات کو استعمال کرنے میں متامل نہیں ہوتے حالانکہ سماجی تحریک کے رہنماؤں کو یہ مقام حاصل کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ لاطینی امریکہ کی مذہبی تحریک کے بائیں بازو کے ان پادریوں کو یاد کیجئے جنہوں نے لاطینی امریکہ کی آزادی کی تحریک کی قیادت کی۔ لیکن ویٹی کن نے انہیں پادریوں کی صف سے خارج کردیا تھا (پوپ جان پال دوم نے انہیں چرچ کے ''اندرونی دشمن'' قرار دیدیا تھا)۔ یہ پادری اپنی کمروں پر کسی ہیوی بیلٹوں میں بندوقیں نہیں باندھتے تھے بلکہ اپنی گردنوں میں کالر پہنتے تھے۔ پوپ کے حکم کے باوجود وہ غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کی فوج میں شامل ہوگئے۔

بن لادن کو لیجئے۔ اس کے پاس کوئی مذہبی اسناد نہیں تھیں اور نہ ہی اس نے کسی دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی اور جو اسلامی قانونی اور مذہبیت کے بارے میں معمولی معلومات رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے طور پر مذہبی مقام حاصل کرلیا اور فتوے جاری کرنے لگا حالانکہ یہ اتھارٹی صرف ان علماء کے پاس ہوتی ہے جو اعلیٰ مذہبی مدارس سے سند یافتہ ہوتے ہیں۔ مذہبی اختیار کے استعمال کے لئے اس نے شعوری کوشش کی جس نے بن لادن کو مسلمانوں خصوصاً حسیب حسین اور اس کے ۷/۷ بمبار ساتھیوں جیسے نوجوان یورپی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ یہ نوجوان خود بھی اسلامی قانون اور علم الٰہیات سے قطعی طور پر نابلد تھے لیکن ان کی اپنی مسلم برادری سے دوری کے احساس نے انہیں متبادل روحانی قیادت تلاش کرنے پر مجبور کردیا۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بن لادن ان نوجوان مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی رہنماؤں کی باتیں نہ سنیں اس لئے کہ وہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ ''میرے نزدیک ان سرکاری اسناد رکھنے والے ملاؤں کی کوئی حیثیت نہیں''۔ اس نے یہ اعلان کیا۔ درحقیقت بن لادن

یہ حیران کن دعویٰ کرتا ہے کہ ان ''منافق اماموں'' (اس سے مراد وہ ملاّ ہیں جو اس کی پیش کردہ اسلامی تشریح سے اتفاق نہیں کرتے) کی تقلید کرنے کا مطلب ''خدا کی بجائے ان منافق اماموں کی عبادت کرنا ہے''۔ پھر وہ بیباکی کے ساتھ وہ فرض اپنے اوپر لے لیتا ہے جو روایتی طور پر اسلام کے مذہبی اماموں کے سپرد ہے۔ ان اماموں کے اختیار میں ہے کہ وہ جس چیز کو چاہیں صحیح قرار دیدیں اور جس کو چاہیں غلط قرار دے کر اس پر عمل کرنے والوں کو سزائیں دیدیں۔ یہ اس کی ہنر مندی کا کمال تھا کہ جس کے ذریعے اس نے نوجوان مسلمانوں کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے مذہبی رہنماؤں کے احکامات ماننے سے انکار کر دیں اور ان مذہبی رہنماؤں کے اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ سماجی تحریک مختلف نسلی، ثقافتی، لسانی اور قومی سرحدیں رکھنے کے باوجود تمام ارکان کو یکجا رکھنے کیلئے علامتوں کا استعمال کرتی ہے۔ ان علامتوں کو موثر بنانے کے لئے تحریک کے ارکان کو ان سے روشناس کرایا جاتا ہے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ ان علامتوں کو اچھی طرح پہچان پائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے اور ان میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کیلئے ان کو سماجی قدروں کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں چیلنج کر سکیں۔ مذہب میں بہت سی علامتیں موجود ہوتی ہیں۔ جنہیں لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ علامتیں لفظوں، محاوروں اور تشبیہات کی صورت میں ہوتی ہیں جن کی تشریح اور توضیح ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کر لیتا ہے۔ تحریک بھی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے ان علامتوں کا سہارا لے کر اپنی مرضی کی تشریح کرتی ہے۔ مثال کے طور پر سرگرمی یا جوش، ذاتی پارسائی یا صالح انقلاب کی علامت ہو سکتی ہے۔ صلیب کو بیک وقت امن کا پرچم اور جنگ کا پھریرا قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاد بیک وقت گناہ کے خلاف اندرونی جدوجہد اور آزادی کے لئے بیرونی جدوجہد ہو سکتا ہے۔ ان علامتوں کو معانی دینے کا فریضہ روائتی مذہبی حکام کے ذمے ہوتا ہے لیکن سماجی تحریک نے ان علامتوں کو نئے معانی دے کر تمام تر صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ تشدد کی اجازت دینے کے لئے مذہب کی اہلیت، اس کو جائز اور صحیح قرار دینے، اس کو استحکام بالمقابل انتشار، اچھائی بمقابلہ بدی کے فریم ورک کے اندر کائناتی سانچے کو ڈھالنا سماجی تحریک کی کامیابی کیلئے ناگزیر ہوتا ہے۔ جیسا کہ سوشیالوجسٹ سڈنی ٹیرو لکھتا ہے کہ

''بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیک وقت حامیوں کو باندھے رکھنا، مخالفوں کی تذلیل کرنا اور تحریک کی طاقت اور جرات کا اظہار کرنا ایک منظم اور مشترکہ طور پر کئے جانے والے تشدد کے عمل سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

محبت، سخاوت، خیر خواہی اور انسانی صورتحال کے دوسرے پیکروں کی طرح تشدد بھی مذہب کا ایک ضروری عنصر ہوسکتا ہے۔ جب تک مذہب الٰہیاتی سوچ وفکر کی تمنا تک محدود رہتا ہے تب تک وہ معاشرتی گروہ بندی کی ترتیب وترکیب کی حدود سے باہر نہیں نکلتا۔ اس ترتیب و ترکیب میں نسل، ثقافت، سیاست، قوم پرستی شامل ہیں جو مذہب کی طرح اندرونی گروہوں اور بیرونی گروہوں کے درمیان سرحدیں قائم کرتی ہیں اور جو ایسا کرنے کیلئے مذہب ہی کی طرح تشدد کا استعمال کرتی ہیں۔ سینکڑوں برسوں سے مختلف ثقافتوں کے بیچ میں مذہب اور تشدد کا ایک دوسرے کو کاٹنا انسانی تاریخ کا حصہ رہا ہے لیکن اس کا منطق یا بذات خود مذہب کے جوہر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور تشدد مشترک شناخت کی دائمی نشانیاں ہیں۔ آسان اور موثر انداز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''ہم'' کون ہیں اور ''وہ'' کون ہے''۔

یقینی طور پر مذہب عدم تشدد اور سول نافرمانی کو فروغ دینے میں ویسا ہی موثر کردار ادا کرتا ہے جیسا کہ امریکہ کے شہری حقوق کی تحریک یا ہندوستان کی برطانیہ سے آزادی کی تحریک نے ادا کیا تھا۔ لیکن وہ تحریکیں جو ایسے معاشروں میں چلتی ہیں جہاں جمہوری ادارے یا تو وجود ہی نہیں رکھتے یا پھر ان اداروں کو غیر جمہوری حکومتیں طاقت کے ذریعے دبا دیتی ہیں اور جہاں قانونی طور پر قائم حزب اختلاف کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، وہاں سماجی تحریک کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے واحد مشترکہ تشدد کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال لاطینی امریکہ کی لبریشن تھیالوجی تحریک ہے۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں سیاسی طور پر متحرک کچھ پادریوں نے لبریشن تھیالوجی کی بنیاد رکھی جو عیسائیت کی عمومی طور پر جانی پہچانی علامتوں اور استعاروں پر تکیہ کرتی تھی۔ (مثال کے طور پر وہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے آخری کھانے کی یاد میں کھانا کھانا اور شراب پینا، حضرت عیسیٰ کا تشدد برداشت کرنا، خدا کی بادشاہت کا آنا) اس تحریک کا مقصد لاطینی امریکہ کے غریب اور نادار لوگوں کو ایک واحد مشترکہ شناخت پر متحد کرنا اور انہیں مروجہ سوشل آرڈر کو چیلنج کرنے کے

لئے کھڑا کرنا تھا۔ حضرت عیسیٰ کو ایک غریب، ان پڑھ اور انقلابی کے طور پر پیش کیا گیا جو اپنے زمانے کے حکمرانوں کے خلاف نچلے طبقات کی خاطر لڑنے والا ہے۔ اس طرح لبریشن تھیالوجی نے انجیل کی کہانی کو قطعی سوشیو پولیٹکل حوالوں سے بیان کر کے لوگوں کو نکاراگوا، السلویڈور اور گوئٹے مالا کی امریکی حمایت یافتہ حکومتوں کے ظلم وتشدد کے خلاف منظّم کیا۔

ان ملکوں کی حکومتوں نے لبریشن تھیالوجی کی تحریک کو ہولناک ریاستی تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی۔ فوجیوں نے کلیساؤں کی ننوں کی نہ صرف عصمت دری کی بلکہ انہیں عصمت دری کے بعد قتل کر دیا اور کلیساؤں میں عبادت کے دوران پادریوں کو اجتماعی طور پر قتل کیا۔ ان حکومتوں کو یقین تھا کہ بین الاقوامی کمیونٹی ان بدافعال کے حوالے سے ان ملکوں کی حکومتوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ (یاد رہے کہ رونالڈ ریگن نے ان اقدامات کی کھل کر حمایت کی اور لبریشن تھیالوجی کو امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کیلئے خطرہ قرار دیا)۔ عیسائی انقلابیوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ خود بھی تشدد کی کارروائیاں شروع کر دیں۔ جیسا کہ فادر ارنیسٹو کارڈینل نے، جو نکاراگوا کے سینڈی نسٹا انقلاب میں شامل ہو گیا تھا، اعلان کیا ''عیسیٰ کہتا ہے کہ ہم دشمنوں سے محبت کریں لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم ان کے خلاف جنگ نہ کریں..... مسیح نے تلوار اٹھانے سے منع کیا ہے لیکن مشین گن اٹھانے سے منع نہیں کیا''۔

آرام دہ زندگی گزارنے والے اور متوسط طبقے کے وہ لوگ جو شمالی امریکہ اور مغربی یورپ کے نواحی علاقوں میں رہتے تھے، ان کے لئے یہ اعلان بے حد تکلیف دہ تھا۔ لاطینی امریکہ کی لبریشن تھیالوجی تحریک کے بے شمار لوگوں نے جن میں آرچ بشپ آسکر رومیرو بھی شامل تھے اپنی جانوں کی قربانی دی۔ آرچ بشپ آسکر رومیرو نے کہا تھا کہ انصاف کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا اور اگر انصاف کے لئے جنگ لڑی جائے تو چرچ اس کی مذمت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے تشدد قرار دے سکتا ہے۔

چرچ کو لکھے گئے اپنے ایک خط میں رومیرو کہتا ہے کہ ''ہم جانتے ہیں کہ کسانوں، مزدوروں اور غربت زدہ علاقوں میں رہنے والوں کی بھاری تعداد نے اپنے حقوق کے تحفظ اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کے لئے خود کو جس طرح منظّم کیا ہے انہیں ان کے اس عمل پر دہشت گرد اور معاشرے کو تباہ کر دینے والے قرار دے کر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے،

انہیں غائب کر دیا جاتا ہے یا وہ قتل کر دیئے جاتے ہیں اور کوئی قانون اور عدالتی ادارہ ایسا نہیں جو ان کو تحفظ یا انہیں اپنے دفاع کا موقع مہیا کر کے تا کہ وہ خود کو معصوم ثابت کر سکیں۔ ان مشکل اور اذیت ناک حالات میں وہ تشدد کے ذریعے اپنا تحفظ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ ایک جائز بات ہے''۔

اس حقیقت کو جاننا زیادہ ضروری ہے کہ رومیرو نے جس قسم کے تشدد کا حوالہ دیا ہے وہ ایک منظم اور مذہبی رسم کے طور پر سمجھا جاتا ہے، اسے متبرک تشدد بھی کہا جاتا ہے۔ مارک جوئرز جنیسمیئر لکھتا ہے کہ نکاراگوا، السلویڈور اور گوئٹے مالا میں عیسائی انقلابیوں نے محض سیاسی سطح پر جبر سے آزادی کی جدوجہد کو سیاسی تصادم کے طور پر نہیں لیا بلکہ اسے اچھائی اور بدی کی لازوال طاقتوں کے درمیان کائناتی تصادم سمجھا ہے ایک ایسا تصادم جس میں خدا دولت مندوں اور طاقتوروں کے خلاف غریبوں اور لاچاروں کے ساتھ ہے۔ یہ ایک ایسا تصادم ہے جس میں ہر ایک کو کسی نہ کسی کا ساتھ دینا چاہیے۔ فادر کارڈینل کہتا ہے کہ ''یا تو ان کے ساتھ ہو جو قتل ہو رہے ہیں یا ان کے ساتھ جو قاتل ہیں''۔

اگر چہ تشدد سماجی تحریک کا جزو لاینفک ہو سکتا ہے اور اگر اسے مزید گہرائی سے دیکھیں تو یہ ایک مواخذہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے جیسا کہ جہاد ازم کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں۔ ایک طرف تشدد یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تبدیلی ممکن ہے تو پھر ان لوگوں کو قائل کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے تحریک کا حصہ بنیں۔ خودکش بمباری جیسے اقدامات سے کامیابی ہوتی نظر آتی ہے اور ان کامیابیوں کو سامنے رکھتے ہوئے تحریک کے مزید ارکان اس عمل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف تشدد کے نتیجے میں ریاست زیادہ جبر و تشدد پر اتر آتی ہے اور اس کے نتیجے میں تحریک اور زیادہ پر تشدد ہو جاتی ہے جس سے ہمدرد خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تحریک کی رنجشیں اور تکلیفیں فنخ یا باطل ہو جاتی ہیں۔ یہ سماجی تحریکوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ آیا یہ مذہبی طور پر صحیح ہے یا نہیں۔ تحریک کے خلاف جس قدر زیادہ تشدد کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں تحریک مزید پر تشدد ہوتی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں آخر کار لبریشن تھیالوجی تحریک کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تحریک، گلوبلائزیشن مخالف تحریک، تحریک نسواں، سیاہ فاموں کی تحریک اور ان جیسی متعدد دوسری تحریکیں کمزور ہو گئیں۔ جہاں تک سماجی تحریک کا معاملہ ہے تو سماج کے سامنے دو راستے

ہوتے ہیں۔ یا تو یہ تحریک کے ارکان کی شکایات کا ازالہ کرسکتی ہے جس سے تحریک بیگانگی کا شکار ہو جاتی ہے یا پھر ان شکایات کو کوئی اور رخ دے کر تحریک میں مزید شدت پیدا کرسکتی ہے۔ جیسا کہ سڈنی ٹیرو کہتا ہے کہ ''گلیوں بازاروں میں تصادمات سے پیدا ہونے والے معاملات کو حکومتی دفتروں میں یا پھر سنگینوں کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے''۔ عالمی جہادازم کا سامنا کرنے کے حوالے سے یورپی حکومتوں کو جو چیلنج درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کیا اس کے خلاف زیادہ طاقت کا استعمال کیا جائے یا اس کے ساتھ مزید مطابقت پیدا کی جائے۔ حکومتیں جو بھی راستہ اختیار کریں گی اس سے واضح ہوگا کہ یورپ میں جہادازم آیا بتدریج غیر اہم ہو رہا ہے یا یورپ کی طرف ہجرت کرنے والی قوموں کے گھاؤ اتنے گہرے ہو جائیں گے کہ جو مکمل انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔

یورپ میں دو کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں جن کی اکثریت سابق یورپی نوآبادیوں سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ میں ہجرت کو نو آبادیوں کی آزادی کے بے ہنگم عمل کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ میں مہاجروں کی اکثریت، جس میں حسیب حسین، محمد صدیق خان اور شہزاد تنویر بھی شامل ہیں، کا تعلق جنوبی ایشیا (بھارت، پاکستان، کشمیر) سے ہے جبکہ فرانس میں آباد ہونے والے مہاجروں کی اکثریت کا تعلق فرانسیسی کالونیوں، مراکش اور الجزائر وغیرہ سے ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے مزدور بھاری تعداد میں ہجرت کر کے یورپ میں آئے۔ ان کو وہاں رہنے کی اجازت اس لئے دی گئی تا کہ جنگ عظیم دوم میں ہونے والی تباہی کا ملبہ صاف کروایا جاسکے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کا تعلق حکومت سے کم کم ہی تھا اس لئے کہ انہیں نجی فرموں نے بھرتی کیا تھا اور انہیں الگ الگ ہوسٹلوں اور مہمان خانوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ بے حد غریب لوگ تھے۔ ان کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی اور انہیں یورپی معاشرت سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ ان لوگوں نے پھر زبانوں، مذاہب یا الگ ثقافتوں کی بنیاد پر اپنے اپنے گروہ بنالئے۔ اپنے آبائی وطن سے ان کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا اور وہ اپنی بیویوں اور بچوں کو رقوم بھیجتے رہتے۔ گنتی کے چند لوگ ایسے ہوں گے جو یورپ میں مستقل طور پر آباد ہونا چاہتے تھے۔

۱۹۷۳ء میں تیل پر پابندی لگنے کے بعد عالمی معیشت میں بحران پیدا ہو گیا جس کے سبب

پورے یورپ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو ملازمتوں سے فارغ ہونا پڑا۔ امیگریشن قوانین کو سخت کر دیا گیا۔ بہت سے ملکوں نے اپنے ہاں آنیوالوں کیلئے ضروری قرار دے دیا کہ ''وہ ذاتی تعلق کے ثبوت'' مہیا کریں۔ امیگریشن پر سخت پابندیوں کے باوجود نئے قوانین نے یورپ میں مائیگریشن کی ایک دوسری لہر پیدا کر۔ اور وہ یوں کہ یورپ میں پہلے سے آنے والوں نے اس خوف کے باعث کہ نئی قانونی پابندیوں کی وجہ سے کہیں وہ اپنے بیوی بچوں سے ہمیشہ کیلئے جدا نہ ہو جائیں، انہیں اپنے پاس بلانا شروع کر دیا اور یوں ہجرت کر کے آنیوالوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔

تارکین وطن کے خاندانوں کے ملاپ نے خصوصاً لیڈز، برلن اور روٹر ڈیم جیسے شہری علاقوں میں یورپی مسلمانوں میں قدامت پرستی اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کے احساس کو بہت فروغ دیا۔ اجنبی اور غیر مانوس دیسوں میں رہنے کی وجہ سے اسلام خاندانوں کو جوڑنے کی مضبوط بنیاد بن گیا۔ آہستہ آہستہ بیسٹن ہل، برلن کے علاقے کوٹ بسّر چھوٹا استنبول بھی کہا جاتا تھا، میں خصوصاً اور پورے یورپ میں عمومی طور پر نسلی بنیادوں پر بستیاں آباد ہونا شروع ہو گئیں۔ ان آبادیوں کی گلیوں میں گندگی کے ڈھیر لگنے لگے۔ ان علاقوں کی عمارتیں خستہ حال تو تھیں ہی، اب اور زیادہ خستہ حال ہو گئیں۔ ترکی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کے اڈے قائم ہو گئے، عرب مارکیٹیں وجود میں آ گئیں اور روٹر ڈیم کے عین درمیانی علاقے میں کہیں کہیں جنسی لذت کے اڈے بھی کھل گئے۔ یاد رہے کہ روٹر ڈیم کی کل آبادی کے پچیس فیصد حصے کا تعلق ترکی یا مراکش سے ہے۔

برطانیہ سے برسلز تک کے سفر کے دوران آپ کو بار بار اس تنبیہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان تارکین وطن نے پورے یورپ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس خوف کو ''لنڈنستان' جیسی لکھی گئی کتابوں نے بڑھاوا دیا۔ ''لنڈنستان'' کے ساتھ ساتھ ''جب یورپ سو گیا'' اور دائیں بازو کے صحافی ٹونی بلینکلے کی تحریر کردہ کتاب ''مغرب کیلئے آخری موقع'' بھی شائع ہوئیں اور بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ ان کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ شدت پسند اسلام کا خطرہ آج پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے بالکل اسی طرح جیسے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں نازیوں نے یورپ کو اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ ہسٹریائی فقروں اور آراء کو سنجیدگی سے لینا مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی پوری آبادی میں مسلمانوں کی کل تعداد دو سے چار فیصد بنتی ہے اور اعداد و شمار کے ماہرین

کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کسی بھی صورت میں یورپ کی کل آبادی کے چھ فیصد سے زائد نہیں۔ سوشیالوجسٹ مارک سیجمین کی تحقیق کے مطابق گذشتہ چند برسوں کے دوران عالمی جہادی تحریک میں حصہ لینے والوں میں اسّی فیصد وہ لوگ ہیں جن کا تعلق تارکین وطن کی پہلی یا دوسری نسل سے ہے جو زیادہ تر یورپ میں آباد ہیں۔ یہ حیران کن اعداد و شمار ہیں جن سے کچھ لوگوں نے یہ اخذ کیا ہے کہ یورپ میں انتہا پسند اسلام کے فروغ کی بنیادی وجہ یکجہتی کا نہ ہونا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو جہادازم کے چنگل میں پھنسنے سے بچانے کیلئے ضروری ہے کہ انہیں یورپی معاشرے کا پوری طرح حصہ بنایا جائے۔ ضروری ہے کہ انہیں سیکولر بنایا جائے اور مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔ یہ یورپ کی زبانیں سیکھیں اور یورپ کی روایات کو اپنائیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی اقدار کا اپنے نئے گھر کی قدروں کے ساتھ ملاپ کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر انہیں اپنے گھروں کو واپس چلے جانا چاہیئے۔

اس دلیل کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یورپ میں رہنے والے زیادہ تر مسلمانوں نے خود کو یورپی معاشرتی قدروں میں ڈھال لیا ہے۔ یورپی مسلمان خصوصاً تارکین وطن کی دوسری اور تیسری نسل یورپی زبانیں بولتی ہے۔ یورپی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرتی ہے اور زیادہ تر لوگ یورپی طرز زندگی اپنا چکے ہیں۔ یورپ میں اسلام نے یورپ کے مذہبی اور ثقافتی تصورات کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لیا ہے۔ انفرادی آزادی، انسانی حقوق، لبرل ازم اور جدیدیت کے نظریات اسلام میں سمو لئے گئے ہیں باسم طبی اس کے لئے ''یوروا سلام'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

حزب التحریر کی یورپی شاخ جیسی بنیاد پرست اور جمہوریت دشمن تنظیم بھی، مکمل طور پر یورپی وضع قطع میں ڈھل چکی ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی تنظیم ہے اور تشدد کو مسترد کرنے کے باوجود یہ دنیا میں خلافت کو دوبارہ رائج کرنے پر زور دیتی ہے۔ یہ تنظیم یورپی شہری حقوق کی زبان استعمال کرتی ہے اور یورپی آئین میں دی گئی سیاسی آزادی اور سہولتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور یورپی لوگوں جیسی مراعات کی خواہاں ہے اور یورپی سول سوسائٹی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنے پیغامات کو عام کرنے کی اجازت مانگتی ہے حالانکہ اگر وہ یہ سہولتیں اپنے ملکوں میں مانگیں تو انہیں جیل کی ہوا کھانا پڑے اور ریاستی جبر کا سامنا کرنا پڑے۔

حزب التحریر کے ارکان پورے برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی اور

داخلہ پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ وہ مارچ کرتے ہیں، سیمینار منعقد کرتے ہیں جن میں وہ اپنے مذہبی اور سیاسی عقیدوں کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ یہ مانیں یا نہ مانیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نوجوان روشن خیالی کے بچے ہیں، روشن خیالی کی پیداوار ہیں۔ یہ یورپ ہی ہے جو انہیں اپنے سیاسی نظریات کی تبلیغ کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ اسلام میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ دراصل وہ سرحدوں کے بغیر دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی دنیا چاہتے ہیں جس میں وہ اس وقت رہ رہے ہیں۔ یورپی یونین عالمی خلافت کا ایک نمونہ ہے ماڈل ہے۔

بہرحال یورپ کے جہادیوں کے لئے کلیّت میں کمی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ حسیب حسین تمام حوالوں سے برطانوی معاشرے سے جڑا ہوا تھا۔ اسی طرح ۷ ستمبر کے حملوں کی رہنمائی کرنے والا محمد صدیق خان بھی برطانوی معاشرت میں رچ بس چکا تھا۔ وہ ایک مقبول سکول ٹیچر تھا اور اپنے غیر مسلم دوستوں میں ''سِٹہ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جمال ضیغم میڈرڈ کا ایک کامیاب کاروباری شخص تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کو ۱۱ مارچ ۲۰۰۴ء میں سپین کی ٹرین میں دھماکہ خیز مواد رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا اس دھماکے میں ۱۹۱ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ وال سٹریٹ جرنل کے رپورٹر ڈینیل پرل کا قاتل احمد عمر سعید شیخ برطانیہ کے ایک خوشحال متوسط گھرانے میں پیدا ہوا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔

یہ لوگ ڈاکٹر ہیں، انجینئر اور وکیل ہیں اور اپنے خاندانوں کے بہترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تارکین وطن خاندانوں کے لئے فخر کا باعث تھے۔ یہ سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سماجی شعور رکھنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس مادی وسائل کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی ہوتی ہے اور وہ تسلیم شدہ سماجی نظام میں تبدیلی کے لئے بہتر طور پر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جہادازم ایسے ہی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اگر وہ ان حالات کا شکار نہ ہوتے تو یہ لوگ گلوبلائزیشن کے خلاف اور شہری حقوق کی تحریک میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتے تھے۔ حسیب حسین جیسے جہادی نظریاتی سطح پر انتہا پسند لوگ ہیں اور تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کرتے اور جہادازم کو سماجی تحریک ہی قرار دیتے ہیں۔ ٹیرو لکھتا ہے کہ ''انتہا پسندی ان معانی کی مبالغہ آرائی کی شکل ہے جو تمام سماجی تحریکوں میں پائی جاتی ہے (بالکل ایسے ہی جیسے تشدد مشترکہ چیلنجوں کی بہت بڑی علامت ہوتی ہے)

حسیب اوسط درجے کا طالب علم تھا جسے تعلیم کی بجائے کھیلوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ تاہم

اس نے ہائی سکول پاس کرلیا اور ایڈوانسٹر بزنس پروگرام میں ڈگری حاصل کرنے کیلئے کوشاں تھا۔ وہ اور ۷ ستمبر کی بمباری کے ذمہ دار دوسرے نوجوان کسی مذہبی مدرسے میں نہیں پڑھے تھے۔ یورپ اور شمالی امریکہ میں عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیم دینے والے مدرسے دہشت گردوں کی فیکٹریاں ہیں جہاں نوعمر مسلمان بچوں کو ''کافر'' سے نفرت سکھائی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں تیرہ فیصد جہادی ایسے ہوں گے جنہوں نے کسی قسم کی مذہبی تعلیم حاصل کی ہوگی (نونومبر کے واقعہ میں ملوث لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کسی دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی ہو)۔ تاہم یہ تصور اس لئے پیدا ہوا کہ ان غریبوں کے بچے ہی مدرسوں میں پڑھتے ہیں جو کسی اور قسم کی تعلیم مالی وسائل نہ ہونے کے سبب حاصل نہیں کرسکتے۔ بہرحال یورپ ہو یا مشرقی وسطیٰ یہاں کے جہادیوں میں ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ غریب نہیں ہوتے۔

یہ سچ ہے کہ یورپ کے مسلمان تارکین وطن کی معاشی حالت یورپی باشندوں کی معاشی حالت سے ابتر ہوتی ہے۔ غربت، بغض، غصہ، عداوت اور کینہ پیدا کرتی ہے۔ غربت مایوسی پیدا کرتی ہے اور جہادی رہنما غصہ اور مایوسی کو اوزار کے طور پر استعمال کرکے ان نوجوانوں کو اپنی صفوں میں شامل کرتے ہیں۔ تاہم نہ جھٹلائی جانیوالی حقیقت یہ ہے کہ حسیب اور اس کے ساتھیوں جیسے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی اکثریت عالمی جہاد کی طرف کھینچی چلی جاتی ہے۔

حسیب حسین، محمد صدیق خان اور شہزاد تنویر، تینوں ہی بیسٹن میں سٹرٹیفو ڈ سٹریٹ کی مسجد میں عبادت کرتے تھے لیکن ۷ ستمبر کے حملوں کے بارے میں برطانیہ کی سرکاری طور پر جاری کی جانے والی رپورٹ کے مطابق جہادی تنظیم میں حسیب کی شمولیت اس مسجد سے کہیں دور ہوئی بلکہ کسی بھی ایسی جگہ پر نہیں ہوئی جس کا انتہا پسندی کے حوالے سے کبھی ذکر سنا گیا ہو۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ انتہا پسندی کے خلاف یورپی حکومتوں کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کا محور عمومی طور پر مسجدیں ہی ہوتی ہیں۔ ان پر نظر رکھی جاتی ہے۔ جرمنی کی پولیس نے ۲۰۰۲ء سے اب تک تین سو سے زائد مساجد پر دھاوا بولا جس نے جرمنی کی مسلمان آبادی میں غصہ اور ناراضگی کا احساس پیدا کیا۔ اس لئے کہ جہادی مسجدوں میں تو جمع نہیں ہوتے۔ حسیب کی خان اور تنویر سے ملاقات سٹرٹیفورڈ سٹریٹ کی مسجد میں تو نہیں ہوئی تھی بلکہ بیسٹن کے مشہور یوتھ کلب جو ہمارا ہیلتھ لیونگ سنٹر کے نام سے مشہور ہے، میں ہوئی تھی جہاں خان ایک امدادی پروگرام چلاتا تھا۔ نہ ہی یہ لوگ

شمالی لندن کی فنس بری پارک کی مسجد میں ملے تھے جہاں رچرڈ ریڈ اور ذکاریاس موسوی جیسے جہادی عبادت کرتے تھے۔ یاد رہے کہ تکفیری ملّا ابوحمزہ المصری کچھ عرصہ کیلئے اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتا رہا ہے۔ (المصری کو مسجد کے گورننگ بورڈ نے مسجد کی امامت سے نکال دیا تھا اور اس وقت وہ نسلی نفرت پھیلانے کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہے) اس مسجد کو جہادی تیار کرنے کی فیکٹری قرار دیدیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میڈرڈ میں ۳ نومبر کو اور ہمبرگ میں ۹ نومبر کو وقوع پذیر ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کا اس مسجد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

ماڈرن جہادی نیٹ ورک کو خود ساختہ، بعض اوقات طبع زاد اور ایسے دوستوں کے بے ضابطہ گروہ کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے جو اپنی مذہبی گروہ بندیوں سے ہٹ کر یکجا ہو جاتے ہیں (مارک سیجمین انہیں لڑکوں بالوں کے جتھے کہتا ہے) ۷ ستمبر کے واقعہ کی سرکاری تحقیقات کے حوالے سے اس کے یہی معانی سامنے آتے ہیں۔ یہ تحقیقاتی رپورٹ جو نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ''گروہی شناختیں جن کی بنیادیں قوم پرستی پر ہوتی ہیں کم اہم ہو چکی ہیں جبکہ افراد کے ڈھیلے ڈھالے نیٹ ورک عام ہو گئے ہیں اور ان نیٹ ورکس کا مرکز نگاہ ایک شخص ہوتا ہے۔ مسجدوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں اپنے حالات سے تنگ آئے ہوئے وہ بچے جو خود کو اپنی کمیونٹی سے الگ سمجھتے ہیں، پناہ حاصل کرتے ہیں اور ان کا جہاد کی طرف راغب ہونے کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا۔

حسیب اپنی مسجد کے ساتھ رابطے کی وجہ سے اچانک انتہا پسند اسلام کی طرف راغب نہیں ہوا بلکہ ۲۰۰۳ء میں سعودی عرب کے دورے سے واپسی کے بعد اس کے اندر اچانک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے نمازیں پڑھنی شروع کر دیں اور پاکستان کے روایتی ملبوسات پہننے شروع کر دیئے۔ اس نے امام بننے کی باتیں شروع کر دیں۔ اس سب کچھ کے باوجود وہ مکمل طور پر پاکباز نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہادازم جیسی غیر دانشمندانہ اور غیر جسیمی تحریک کا ہدف بنا۔ روحانی رہنما کے طور پر اسامہ بن لادن کی کشش اس لئے اپنی طرف کھینچتی تھی کہ وہ روائتی مولویانہ نظام کا حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بن لادن کوئی مولوی نہیں تھا اور نہ ہی اس نے مذہبی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اپنی تقریروں اور اعلامیوں میں عام طور پر روائتی مسلمان مولویوں کو ''الحاد کے امام''، ''شکست خوردہ امام'' یا ''منافق امام'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا (محمد صدیق خان کے

لفظوں میں ''ہمارے نام نہاد علماء) جب بن لادن نے یہ اعلان کیا کہ ۹/۱۱ کے ہائی جیکروں نے حضرت محمدؐ کے دیئے گئے قانون کے مقابلے میں تمام روائتی نظریات کو مسترد کر دیا ہے تو وہ یہ نہیں تجویز کر رہا تھا کہ یہ لوگ محض اچھے اور وفادار مسلمان تھے بلکہ وہ واضح کر رہا تھا کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبر کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر ان ''مسلمان علماء'' کی تضحیک کر رہا تھا کہ یہ لوگ خدائی قانون کے شارح نہیں ہو سکتے۔ ''تم اپنے آپ کو ان نام نہاد علماء کے ساتھ مت جوڑو جو اپنی خواہشوں کے غلام ہیں اور جو زمین پر بوجھ ہیں''۔ بن لادن نے اپنے پیروکاروں کو خبردار کیا اور کہا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے بارے میں جھوٹ پھیلا رہے ہیں اور تمہیں جہاد سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔

عقلی سطح پر چونکہ جہاد ازم روائتی علماء کی برابری نہیں کر سکتا اس لئے اس روایتی مذہبی اتھارٹی کا استرداد ضروری ہو جاتا ہے جس پر اسلامی قانون اور اسلام پر عمل درآمد کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اسلامی قانون اور مولویوں کو مسترد کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان امام ہے اور یہ بات اپنے اندر کشش رکھتی ہے خاص طور پر یورپ میں جہاں کے نوجوان مسلمانوں نے پہلے ہی خود کو روائتی مذہبی اداروں سے دور کر رکھا ہے۔

اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ یہ بچے ہی ہوتے ہیں جن کی جہاد ازم کو ضرورت ہوتی ہے۔ سیگمین کی ریسرچ کے مطابق یورپی اور کینیڈین حکومتوں نے جن جہادیوں کو گرفتار کر رکھا ہے ان کی اوسط عمر بیس سال ہے۔ جس وقت حسین مرا اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ بن لادن کی نظر میں حسین جنت کا بہترین امیدوار تھا۔ بن لادن نے کہا تھا کہ ''ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد کرنے کی بہترین عمر پندرہ سے پچیس سال تک ہے۔ میں نوجوانوں پر زور دیتا ہوں کہ وہ جہاد میں اپنا بھرپور حصہ ڈالیں اس لئے کہ یہ انہی کا فرض بنتا ہے''۔

نوجوان پنے اماموں کے مشکل خطبات اور ان کی امامت میں نمازوں کی ادائیگی سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کے لئے اسلام کی روائتی اور رجعت پسندانہ تشریحات سے مطمئن ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی روحانیت چاہتے ہیں جو مسجد کی چار دیواری میں مقید نہ ہو اور ان کا رشتہ سماجی تحریکوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ اور وہ ملاؤں کے برخلاف اپنی مشترکہ شناختیں قائم کر سکیں۔ جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق ہے تو وہ اپنے طور پر حاصل کرتے ہیں۔ وہ عربی نہیں سمجھتے۔ اسلامی

قانون کے بارے میں نہیں جانتے اور ان لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جو خود کو اسلام کے علمبردار کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بہت زیادہ عقلیت پرستی مذہب کے حوالے سے انسان کی معصومانہ جذباتی کیفیت اور غیر مشروط عقیدے کو تباہ کر دیتی ہے۔ چونکہ یورپ میں عمومی طور پر ان نوجوانوں کی تعلیم اور ابلاغ عامہ کے اداروں تک رسائی آسان ہوتی ہے اس لئے وہ انفرادیت کے یورپی آدرش سے بھرپور طور پر آشناء ہوتے ہیں اس لئے وہ عرب اور دوسرے مسلم ممالک کے نوجوانوں کی نسبت خود ساختہ روحانی پیشواؤں کو روائتی اماموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پورے ''یورپی'' بن چکے ہوئے ہیں۔

ان کے ساتھی شہریوں یا ان کی حکومتوں کی طرف سے انہیں اس کا احساس شاذ و نادر ہی کرایا جاتا ہے۔ اگرچہ پہلی اور دوسری نسل کے مسلمان نوجوان اپنے والدین کی نسبت یورپی معاشرے کا کہیں زیادہ حصہ بن چکے ہیں، اس کے باوجود وہ خود کو یورپی معاشرے سے باہر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی توقعات بہت زیادہ ہیں اور وہ اپنی حیثیت کو تسلیم کرانے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر بہت سے یورپی ملکوں میں شہریت کے محدود بندشی قوانین کی بنیاد خونی رشتوں پر رکھی گئی ہے۔ جس کا مقصد قومیت اور نسل کو یکجا کر کے نسلی یکجہتی قائم کرنا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے تارکین وطن میں معاشرے کے ساتھ جڑے رہنے اور معاشرے کے دوسرے ارکان سے برابری کا احساس قائم نہیں ہو سکا اور وہ خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ترکی سے تعلق رکھنے والا ایک شخص جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کا والد بھی جرمنی میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا دادا بھی جرمنی میں پیدا ہوا تھا لیکن اس ترک کو کچھ عرصہ پہلے تک جرمن شہری نہیں سمجھا جاتا تھا (ان قوانین میں ۱۹۹۹ء میں اصلاح کی گئی تا کہ تارکین وطن کے لئے شہریت کے حصول میں آسانی پیدا ہو سکے)۔

یورپ کے امتیازی قوانین کے خلاف بننے والے قوانین بھی اسی طرح محدود ہیں۔ ان قوانین میں بھی صرف نسلی بنیادوں پر لوگوں کو قانونی تحفظ ملتا ہے۔ اگرچہ حال ہی میں ان قوانین کو ایک ہی مذہب رکھنے والے گروہوں مثلاً سکھوں اور یہودیوں کے حوالے سے لاگو کیا گیا ہے جبکہ مختلف النسل مذہبی گروپوں، جن میں مسلمان، خدا کے شاہدین اور جمیکا کے وہ مذہبی گروہ جو حبشہ کے سابق شہنشاہ ہیل سلاسی کی عبادت کرتے ہیں (رستافیرین) کو مذہبی امتیاز کے خلاف وہی

قانونی تحفظ میسر نہیں جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ اٹلی میں تو مسلمانوں کو مذہبی کمیونٹی کے طور پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا (حالانکہ اٹلی میں مسلمان سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ قانونی طور پر یہ لوگ مذہبی عمارات تعمیر نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان سے اتنا ٹیکس لیا جاتا ہے جتنا دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

پورے یورپ میں دہشت گردی کے خلاف بننے والے نئے قوانین کی وجہ سے معاملات اور زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ ان نئے قوانین کو انسانی حقوق کے کچھ گروپوں نے ''آئینی امتیاز'' قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا ہے۔ ان قوانین نے مذہبی گروہوں اور قانون نافذ کرنے والے حکام کے درمیان تعلقات کو زہر آلود کر دیا ہے۔ چنانچہ اب نوجوان یورپی مسلمان اعلانیہ کہتے ہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں پولیس والوں کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے۔ انہیں خوف ہے کہ وہ مختلف جرائم میں دھر لئے جائیں گے جو انہوں نے نہیں کئے۔

ان میں بہت سے نوجوان محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایسے براعظم میں رہتے ہیں جہاں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اسلام کا فوبیا عام ہو گیا ہے اور اس کی تصدیق نسل پرستی اور نفرت کے حوالے سے کام کرنے والے یورپین مانیٹرنگ سنٹر نے بھی کی ہے۔ ویانا میں قائم ہونے والی اس تنظیم نے اپنی ۲۰۰۶ء کی رپورٹ میں جو نتیجہ پیش کیا ہے اس کے مطابق دفتروں اور ہاؤسنگ مارکیٹوں میں مسلمانوں کے خلاف غنڈہ گردی معمول بن چکی ہے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے کئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ معاملہ صرف ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ پورے یورپ میں یہ صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔ (ایلن سباخ میننگز فار سٹنگ انسٹیٹیوٹ کے سروے کے مطابق ۸۳ فیصد جرمن باشندے لفظ اسلام کو دہشت گردی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں) اس مطالعاتی رپورٹ کے لئے جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سے بات چیت کی گئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں یورپی معاشرے میں شامل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ''اسلامی شناخت'' کو ختم کر دیں اس لئے کہ یا تو وہ مسلمان رہ سکتے ہیں یا پھر یورپین ہو سکتے ہیں لیکن وہ بیک وقت مسلمان اور یورپین نہیں ہو سکتے۔

یہی وہ چیلنج تھا جس کا سامنا حسیب حسین کو کرنا پڑا تھا۔ اپنے زیادہ تر ہمجولیوں کی طرح حسین نے (تنویر اور خان بھی) اپنے خاندانوں کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کیلئے پاکستان کے

دورے کئے اور اپنے کئی ہمجولیوں کی طرح اسے بھی یہ شدید احساس ہوا کہ اس کا اپنے والدین کے ملک یا ثقافت کے ساتھ معمولی سا جذباتی تعلق باقی رہ گیا تھا۔ برطانیہ میں حزب التحریر کے ایک سابق رکن کا کہنا ہے کہ یورپ میں رہنے والے متعدد مسلمان نوجوان اسی مسئلہ سے دوچار ہیں۔ حسین کا کہنا تھا کہ ''جب میں پاکستان گیا تو مجھے مسترد کر دیا گیا، میرے ہونے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور جب میں برطانیہ واپس آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں وسیع برطانوی کمیونٹی کے لائق نہیں ہوں اور آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سے والدین یہ چاہتے بھی نہیں کہ ہم برطانوی کمیونٹی کا حصہ بن جائیں''۔

ان نوجوان مسلمانوں کو شناخت کے بحران کا سامنا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ ان کا تعلق نہ تو مغرب سے ہے اور نہ ہی مشرق سے۔ چنانچہ وہ نئی شناختیں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ایسی شناختیں جنہیں کوئی ثقافت یا معاشرہ اپنے محاصرے میں نہ لے سکے، انہیں محدود نہ کر سکے اور چونکہ نسل، رنگ اور قومیت کی تمام تر سرحدوں سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے میں سمو سکیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ حدوں کے بغیر شناخت چاہتے ہیں جو اس دنیا کو جس میں وہ رہتے ہیں، سرحدوں سے ماورا کر دے اور یہ شناخت انہیں آن لائن ملتی ہے۔ اس کے لئے انٹرنیٹ کا شکریہ کہ جس کی وجہ سے جہادیوں کی سوچ اور ان کی خواہش کو حقیقت کا روپ مل سکا ہے۔

انٹرنیٹ کے ذریعے جہادی رہنماؤں کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے پیغام کو دنیا بھر میں عام کر سکیں۔ القاعدہ کا تو باقاعدہ ایک میڈیا ونگ ہے جو الصحاب کے نام سے کام کرتا ہے۔ یہ ونگ تحریری مواد تیار کر کے روزانہ دنیا بھر کے لوگوں تک انٹرنیٹ کے ذریعے پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ معیار کی پراپیگنڈہ ویڈیوز اور دستاویزی فلمیں انٹرنیٹ پر مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے جاری کی جاتی ہیں۔ بن لادن اور دوسرے رہنماؤں کے پیغامات اسی طرح دنیا بھر میں پھیلائے جاتے ہیں۔ ان ویڈیوز میں عام طور پر دنیا بھر کے مسلمانوں پر ہونے والی ہولناک مغربی جارحیت کو دکھایا جاتا ہے۔ ان تصویروں کے ساتھ ساتھ عراق اور افغانستان میں ہونے والے جہادیوں کے کامیاب حملوں کی تصویریں بھی جاری کی جاتی ہیں جن سے یوں لگتا ہے جیسے جہادی پوری دنیا کے غلام اور ظلم و تشدد برداشت کرنے والے مسلمانوں کے نجات دہندہ ہیں۔

اگرچہ انٹرنیٹ جہادی رہنماؤں کے لئے ایک ایسا آلۂ ابلاغ ہے جس کی قدر و قیمت بہرحال بہت زیادہ ہے لیکن بحث طلب معاملہ یہ ہے کہ ان کی یہ آن لائن جارحیت نوجوان مسلمانوں کو ''انقلابی'' بنانے میں کیا کردار ادا کرتی ہے (۷ جولائی کے حملوں کی برطانیہ نے سرکاری سطح پر جو تحقیقات کرائیں وہ یہ واضح شہادت مہیا کرتی ہیں کہ حسیب حسین، تنویر اور خان انٹرنیٹ کا استعمال بہت کم کرتے تھے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی تحریکوں میں حصہ لینے والوں کی بہت بھاری اکثریت جنہیں سوشیالوجسٹ، ''فری رائیڈرز'' کا نام دیتے ہیں، ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو تحریک کی شکایات کے حصہ دار ہوتے ہیں، جو تحریک کے مقاصد سے متفق ہوتے ہیں اور جنہوں نے تحریک کی علامتوں کو اپنی شناختیں بنالیا ہے لیکن وہ تحریک کے عملی اقدامات میں براہ راست شریک نہیں ہوتے۔ گلوبل جہادازم کے حوالے سے فری رائیڈرز وہ ہوتے ہیں جو کمروں میں بیٹھ کر بحث مباحثہ کرتے ہیں اور جہادیوں کے ویڈیوز کو ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں لیکن وہ جہادازم میں صرف اس قدر کشش محسوس کرتے ہیں کہ جیسے یہ بھی کوئی اسٹیبلشمنٹ مخالف تحریک ہو۔ ان کے جہادازم کی شکل ''پاپ کلچر جہادازم'' جیسی ہے۔ اس کا مہاندرا بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں طلبہ کی انقلابی تحریکوں جیسا ہے۔ ساتویں دھائی جیسا اور یا پھر نویں دہائی کی ''اینٹی کلچر موومنٹ'' جیسا ہے۔ انہیں اپنے پہناووں پر فخر ہے، اپنی عوامی بولیوں پر فخر ہے، اپنی علامتوں کی موافقت پر فخر ہے، اپنی موسیقی اور کفار کے خلاف اپنے جہادی ترانوں پر فخر ہے۔ یہ بچے سروں پر فلسطینی رومال باندھتے ہیں یا ٹوپی نما چیز سروں پر رکھتے ہیں اور وہ یہ سب ان لوگوں کی نقل میں کرتے ہیں جن کے ساتھ ان کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ اسامہ بن لادن کی تصویر والی ٹی شرٹس پہنتے ہیں جیسے وہ آج کے دور کا چے گویرا ہو۔ یا اسامہ کی تصویر والے پوسٹر اپنے گھروں کی دیواروں پر چپکاتے ہیں جیسے وہ فٹ بال کا کوئی سپر سٹار ہو۔ وہ گلوبل جہادی تحریک کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھتے ہیں اور دنیا بھر کے جہادوں کے لئے ہمدردی محسوس کرتے ہیں ان نوجوانوں کے گروہوں کو توڑنا ایک مشکل کام ہے۔ چنانچہ کہا یہ جاتا ہے کہ ان نوجوانوں کے اندر ایسے لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے جو خود کو القاعدہ کا رکن کہتے ہیں اور جو انہیں جارحانہ اقدام کی ترغیب دیتے ہیں۔

ایک طویل ذاتی تعلق کی بنا پر حسیب حسین ایک غیر مطمئن نوجوان سے جہادی خودکش بمبار میں تبدیل ہوگیا۔ محمد صدیق خان حمارا ہیلتھی لونگ سنٹر میں جس حیثیت میں کام کرتا تھا، اس

کی وجہ سے اسے موقع ملا کہ وہ حسین جیسے لوگوں کو تلاش کر کے انہیں جہادی بننے کی ترغیب دے لیکن ایسے نوجوانوں کو مکمل طور پر جہادی بنانے کی ترغیب اور ان کی تربیت عام مقامات سے دور دی جاتی تھی اور اس مقصد کے لئے ان نوجوانوں کے ساتھ مستقل ذاتی رابطہ رکھنا اور انہیں ایک گروپ کی شکل میں اکٹھے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ سماجی تحریک کو مسلسل تحرک میں رکھنے کیلئے تین اقدامات ضروری ہوتے ہیں۔ پہلا موجودہ سماجی نظام کے جواز کے بارے میں یا اس کی معقولیت کے حوالے سے اعتراض۔ دوسرا لوگوں کو یہ یقین دلانا کہ سماجی نظام کو تباہ کیا جا سکتا ہے اور آخر میں انہیں رضامند کرنا کہ ان کی فعال شرکت کے ذریعے سے ہی تحریک کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ برطانیہ کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۷ جولائی کے بمباروں نے جو طریقہ کار استعمال کیا وہ انہی اقدامات کی عکاسی کرتا ہے اور پورے یورپ کے مسلمان نوجوانوں کو اسی طرز پر جہاد کیلئے تیار کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے امکانی رنگروٹ کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ وہ جہادی پیغام کے بارے میں مثبت سوچ رکھتا ہے یا نہیں۔ رپورٹوں میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ برلن میں جہادی رہنما خود کو والدین بنا کر سکولوں میں طلبہ کے والدین اور اساتذہ کے منعقد ہونے والے اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں، جہاں انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سے طالب علم تعلیمی کارکردگی کے حوالے سے کمزور ہیں، کون سے ایسے بچے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاقات بڑھانے میں مشکل کا سامنا کرتے ہیں اور وہ کون سے طاب علم ہیں جنہیں خراب کارکردگی کی بنیاد پر تعلیمی اداروں سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار ایسے بچوں کی شناخت ہو جائے تو پھر انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے ذریعے ان رنگروٹوں کو بتایا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کو کس قدر ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان پسے ہوئے مسلمان نوجوانوں کو بتایا جاتا ہے کہ اسلام کے روائتی مذہبی اور سیاسی رہنما کس قدر بدعنوان ہوتے ہیں اور کس طرح وہ مظلوم مسلمانوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ''قریبی دشمن'' منافق اور مرتد کہہ کر نوجوانوں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ چین ہو یا کشمیر، چیچنیا، افغانستان یا عراق، ان ملکوں میں مسلمان عوام کو بین الاقوامی تنازعات میں الجھایا جاتا ہے، وہ درحقیقت ''اسلام کے خلاف جنگ'' کا ایک حصہ ہے اور اس مہم کی قیادت مغربی سامراج کرتا

ہے اور مغربی سامراج کو ''دور کا دشمن'' کہا جاتا ہے اور اس قوت کے خلاف صرف جہادی جنگجو ہی اسلام کے تحفظ کیلئے لڑ سکتے ہیں۔ اپنی اس بات کو صحیح ثابت کرنے کیلئے وہ اپنی ان کامیابیوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں جو انہیں ماضی میں سوویت یونین اور حالیہ دور میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف جنگوں میں حاصل ہوئیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ تبدیلی ممکن ہے اور صحیح اور بروقت عملی اقدامات کے ذریعے دنیا کو نئی شکل دی جا سکتی ہے۔

غیر مطمئن نوجوانوں کو یہ سب کچھ بتا کر انہیں سماجی تحریک میں شامل ہونے پر آمادہ کرنا آسان ہوتا ہے اور یہ سماجی تحریک درحقیقت عالمی جہادازم کا دوسرا نام ہے۔ لیکن انہیں عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار کرنا ہی کافی نہیں۔ جہاد کے لئے وہ تبھی تیار ہو سکتے ہیں جب عالمی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں اور شکائتوں کو مقامی سطح پر ہونیوالی ناانصافیوں اور شکائتوں کے ساتھ جوڑا جائے جن کا سامنا انہیں روزانہ ایک اجنبی یا باہر والے شخص کے طور پر ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں روا رکھا جاتا جو ان کے ساتھ رہنے والے یورپی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ملازمتوں، قانونی نمائندگی، شہری حقوق اور تعلیمی شعبے میں انہیں بے خانماں سمجھا جاتا ہے جن کی کردارکشی میڈیا مستقل طور پر کرتا رہتا ہے اور سیاستدان انہیں ریاست کے بے وفا اور غدار کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔ انہیں ایسے غیر ملکی قرار دیا جاتا ہے جنہیں اپنی ثقافتی اور مذہبی شناخت کا حق حاصل نہیں۔ برقع پہننے یا سر پر دوپٹہ رکھنے پر قانونی پابندی اس کی مثال ہے۔ وہ عبادت کے لئے اپنی مسجدیں تعمیر نہیں کر سکتے۔ نہ صرف دائیں بازو کی سیاسی جماعتیں بلکہ پورا یورپی معاشرہ انہیں شیطان تارکین وطن سمجھتا ہے۔ آیان ہرسی علی اور یاسمینا فلاشی اور بریجیٹ گیبرئیل جیسے جعلی دانشوران متقی اور پرہیزگار نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ یہی وہ جعلی دانشور ہیں جن کا روزگار چلتا ہی اسی وجہ سے ہے کہ وہ نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں۔

چنانچہ جب فرانس کی پارلیمنٹ نے سکولوں میں نوجوان مسلمان لڑکیوں کے حجاب پہننے پر پابندی عائد کی تو اس کا واضح مطلب قومی شناخت کی یکسانیت تمام لوگوں پر طاقت کے ذریعے مسلّط کرنا تھا جس سے فرد کی مذہبی یا ثقافتی شناخت متاثر ہوئی چنانچہ ایمن الظواہری نے پوری دنیا میں موجود اپنے پیروکاروں کو پیغام دیا کہ ''فرانس میں حجاب پر پابندی بالکل ویسی ہے جیسے

افغانستان میں لوگوں سمیت گاؤں کے گاؤں جلا دیئے جاتے ہیں، فلسطین میں سوتے ہوئے لوگوں پر ان کے گھر گرا دیئے جاتے ہیں، عراق میں بچوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اس کے تیل کو چوری کر لیا جاتا ہے۔ یہ معاملہ گوانتاناموکے پنجروں میں بند قیدیوں پر ہونے والے ہولناک مظالم جیسا ہی ہے''۔

مسلمانوں پر ہونے والی ناانصافیوں کی بنیاد پر ہی جہادازم کی مذہبی عقیدہ پرستی کے تصور کا سانچہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں یقین دلا دیا جاتا ہے کہ یہ دنیا مظلوموں اور ظالموں، مقتولوں اور قاتلوں، اچھائی اور برائی میں بٹی ہوئی ہے۔ اسی سوچ کو بنیاد بنا کر نئے رنگروٹ یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ معصوم شہریوں اور ان کے ساتھی مسلمانوں کے خلاف جارحانہ جہاد جائز ہے۔ جب اس کی ذاتی شناخت اس سے چھین لی جاتی ہے اور اسے اجتماع کا حصہ بنا دیا جاتا ہے تو پھر رنگروٹ کو خودکش دہشت گردی کرنے کیلئے کہا جاتا ہے اور اسے قائل کیا جاتا ہے کہ جنگ میں یہ اقدام جائز ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات اس کے لئے یہ ہوتی ہے کہ اس طرح وہ اپنے لوگوں کا انتقام لے سکتا ہے۔

خودکش دہشت گرد کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ اپنے دشمن سے شدید نفرت کے باعث یا پھر زندگی کی قدر و قیمت نہ جاننے کی وجہ سے ایسا اقدام کرتا ہے لیکن مارک سیجمین کہتا ہے کہ ''دراصل لوگوں کو اپنی جانیں محض اس لئے کہ وہ اپنے ہدف سے نفرت کرتے ہیں، قربان کرنے پر قائل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایسے لگتا ہے کہ محبت، عزت اور وقار وہ معقول جواز ہیں جن کی خاطر جان قربان کی جاسکتی ہے''۔

حسیب حسین اساسی عالمی تبدیلی کی تلاش میں بس نمبر ۳۰ میں بیٹھا۔ اپنے بہیمانہ جرم کے لئے اس پر کسی نے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ نہ ہی اس کی ذہنی تطہیر کی گئی تھی۔ وہ پرجوش تھا، انتہا پسند تھا، وہ یہ کام اکیلے ہی کر رہا تھا اور اللہ کے تحفظ کے لئے اسے کہیں سے رہنمائی حاصل نہیں تھی۔ وہ سپہ سالار نہیں تھا جسے اللہ نے اپنے منکروں کا خون بہا کر اللہ پر اپنے یقین دلانے کا حکم دیا تھا۔ وہ تو ایک شہید تھا جو ''اپنے لوگوں'' کی زندگیوں کیلئے اپنی زندگی قربان کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ اس کے اندر کا غصہ ہو، اپنی بے عزتی یا اپنے اندر موجود معاشرتی ناانصافی کا احساس ہو جس نے حسین کو عالمی جہاد کی طرف راغب کیا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ محبت ہی تھی جس نے اسے خودکش بم باز

بنا دیا۔ خلاف عقل، گمراہ کن، پراگندہ محبت اور غلط چیز سے عشق، وہ محبت، جس پر کائناتی جنگ کے طور پر جہاد کے رومانوی تصور نے تیل ڈالا کہ وہ اللہ کی طرف سے جنگ لڑ رہا ہے تاکہ اس دنیا کو چند پاؤنڈ وزنی دھماکہ خیز مواد کے ذریعے نئی شکل دے سکے۔

لندن حملوں کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ میں حسیب کے دوستوں اور خاندان کے افراد سے ملنے کے لئے بیسٹن ہل گیا۔ اس کے خاندان میں چند ہی لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان حملوں میں حسیب کا ہاتھ تھا۔ لندن کے اخبار انڈی پینڈنٹ کے ساتھ انٹرویو کے دوران حسیب کا والد جس طرح دھاڑیں مار مار کر رو دیا، اس نے لوگوں کے دل دہلا دیئے۔ حسیب کے والد نے کہا ''ہم اچھے لوگ ہیں، میں نے زندگی بھر محنت مشقت کی ہے۔ مہربانی کر کے ایسا نہ کہیں کہ اس واقعے کے ساتھ میرا کوئی تعلق تھا یا میں، میرا بیٹا اور میری بیوی اس بارے میں کچھ جانتے تھے۔ ہم اچھے اور بہت ہی نفیس لوگ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بس میں میرا بیٹا حسیب نہیں کوئی اور ہوگا۔ وہ ایک اچھا لڑکا تھا''۔ چند ہمسائیوں نے کہا کہ حسیب کو گروپ کے لیڈر محمد صدیق خان نے استعمال کیا تھا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس علاقے میں پھیلنے والی ان افواہوں پر یقین کرتے تھے کہ ۷ ستمبر کی بمباری ''کسی اندر'' کے آدمی نے کی ہوگی تاکہ برطانیہ میں مسلمانوں کا جینا اسقدر دوبھر کر دیا جائے کہ آخر کار وہ یہ ملک چھوڑ کر ہی چلے جائیں۔ بیسٹن کے ایک رہائشی کو اس افواہ پر پورا یقین تھا۔

چند برس بعد جب میں دوبارہ اس علاقے میں گیا تو میں نے دیکھا کہ بیسٹن ہل کے رہائشی یہ تسلیم کر چکے تھے کہ حسیب نے یہ جرم کیا تھا اور اس کے اس جرم میں اس کے دوسرے ساتھی بھی شریک تھے۔ ۷ ستمبر کے واقعہ کے بعد تارکین وطن کے عدم اطمینان میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور لوگوں میں اسلامی اور یورپی اقدار کے درمیان ہم آہنگی کے حوالے سے بحث زوروں پر جاری تھی۔ ذرائع ابلاغ میں یہ بحث زور پکڑ گئی کہ یورپی یونین کی رکنیت کے حصول کیلئے کیا یہ ضروری ہے کہ تارکین وطن اور ان کی اولادیں اپنی ثقافتی مماثلتوں اور اپنی نسل، مذہب اور شناخت کو صرف اس لئے چھوڑ دیں تاکہ وہ یورپی معاشرے میں پوری طرح گھل مل سکیں اور اس کا مکمل حصہ بن جائیں۔

میں نے دیکھا کہ یورپ کے نوجوان مسلمان بہت تیزی کے ساتھ مایوسی کا شکار ہو رہے تھے اور ان کے نزدیک اس کی وجہ یورپی معاشرے کا وہ جبر تھا جس کے نتیجے میں انہیں اسلامی

شناخت کو ختم کر کے ان ملکوں کی قومی شناختوں کو اپنانا تھا جن میں وہ اب رہ رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ کسی بھی قسم کی مذہبی روایات کی پاسداری کا مطلب انہیں یورپ میں بے خانما اور اجنبی کی حیثیت دینا تھا۔ میں نے جن یورپی مسلمانوں سے بات کی ان کی اکثریت کا کہنا تھا کہ یورپی سماج میں خود کو سمانے کی انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ جرمنی میں بسنے والی دوسری ترک نسل کے ایک مسلمان نے مجھے بتایا ''میں یہاں پیدا ہوا تھا۔ میں جرمن زبان بولتا ہوں۔ میں نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ میں قوانین کی پابندی کرتا ہوں۔ میں آئین کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟ مجھے جرمن بننے کیلئے اور کیا کرنا ہوگا؟ ذرا مجھے بتا دو، میں وہ بھی کرنے کو تیار ہوں''۔ جب میں نے جرمنی کی ممتاز یونیورسٹی ''توبن جن'' کے پولیٹکل سٹڈیز کے پروفیسر سے یہ سوال کیا تو اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر چلتے چلتے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ''جرمن بننے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، یا تو تم جرمن ہو یا نہیں ہو''۔

کسی بھی مذہبی، ثقافتی یا سماجی و اقتصادی تقاضوں سے کہیں زیادہ اس پروفیسر کا یہ بیان واضح کرتا ہے کہ یورپ کے نوجوان مسلمان کیوں عالمی جہاد کی طرف ملتفت ہو رہے ہیں۔ عالمگیریت یعنی گلوبلائزیشن اور براعظم یورپ کی تیزی کے ساتھ بدتر ہوتی ہوئی صورتحال کی وجہ سے یورپی یونین کی مقامی آبادیوں کیلئے اپنی ذاتی قومی شناختوں کی وضاحت مشکل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں اندازہ لگائیے کہ تارکین وطن اور ان کے بچوں کیلئے اپنی قومی شناخت واضح کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ اگر حاوی ثقافت کے ساتھ اپنی شناخت کو منسلک کر کے ہی کسی معاشرے کا حصہ بنا جا سکتا ہے تو پھر کوئی بھی شخص کیسے اس معاشرے کا فعال فرد بن سکتا ہے۔ سادہ سی حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے ملک میں جہاں شہری شناخت کی توضیح کرنا مشکل ہو، جہاں نسل اور قومیت کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہو، اس معاشرے میں رہنے والا غیر ملکی ہمیشہ غیر ملکی ہی رہے گا۔

شناخت کے اس خلاء ہی میں عالمی جہاد کا تصور فروغ پاتا ہے۔ حسیب حسین جیسے بچوں کے لئے جنہیں مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی وجہ سے یورپی معاشرے ''دوسرے'' قرار دے دیں شناخت کا متبادل راستہ ''جہاد'' ہی ان کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ رجعت پسندانہ شناخت ہے، یہ سماجی بغاوت کا ذریعہ ہے یہ وہ شناخت ہے جسے مقامی اور عالمی شکووں اور شکایتوں کے

ذریعے شکل دی جاتی ہے۔ان شکووں اور شکایتوں میں حقیقت بھی ہوتی ہے اور بعض کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔ بہرحال اس سے شدید احساس محرومی پیدا ہوتا ہے۔اس احساس محرومی کو ختم کر کے ہی عالمی جہادازم کو شکست دی جاسکتی ہے۔

تقریباً پورے یورپ میں اس عمل کا پہلا حصہ شروع ہو چکا ہے۔ برطانیہ میں حکومت نے سماجی واقتصادی مشکلات کی طرف توجہ دینا شروع کر دی ہے اس کے علاوہ مذہبی اور نسلی امتیاز کے خلاف بھی مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔جس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان تارکین وطن کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ برابر کے شہری حقوق رکھتے ہیں۔نیشنیلٹی قوانین میں تبدیلیاں کی گئی ہیں تا کہ برطانوی قومی شناخت کے تصور کو بہتر طور پر اپنایا جاسکے۔ برطانیہ کی شہریت کے خواہش مند تارکین وطن کے لئے اب ضروری ہے کہ وہ انگریزی زبان جانتے ہوں اور برطانیہ کی تاریخ، ثقافت اور قومی رسم ورواج سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔اس سب کچھ کا مقصد یہ ہے کہ نسلی یا ثقافتی ہم آہنگی کی بجائے مشترکہ قومی روایت پر مشترکہ شناخت کی بنیاد رکھی جاسکے۔ایسی مشترکہ شناخت جس کا حصہ ہر شہری بن سکے۔(فرانس، سپین، اٹلی اور جرمنی میں بھی اسی قسم کے اقدامات کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے تاہم برطانیہ کی نسبت ان ملکوں میں اس حوالے سے کام کرنے کی رفتار سست ہے)۔

اب تک ان اصلاحات پر مسلمان رہنماؤں کا ردعمل بہت مثبت ہے۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی تنظیموں کی طرف سے ان اصلاحات کی متفقہ طور پر حمایت کی گئی ہے۔ایک تنظیم مسلم کونسل آف بریٹن، جو مسلمانوں کی تنظیموں میں سے سب سے زیادہ مضبوط اور متحرک تنظیم ہے، کی طرف سے برطانوی حکومت کے اس اقدام کی تعریف کی گئی ہے کہ برطانیہ میں امامت کی ذمہ داری سنبھالنے کے خواہشمند غیر ملکی لوگوں کے لئے انگریزی زبان میں مہارت رکھنا ضروری ہوگا۔ اس سادہ نظر آنے والے اقدام کے نتیجے میں برطانوی مذہبی رہنماؤں اور ملک کے نوجوان مسلمانوں کے درمیان رشتہ اور تعلق بہتر ہوا ہے۔اس اقدام کی وجہ سے مساجد اور اسلامی مراکز کو اجازت مل گئی ہے کہ وہ خود کو، اسلامی کمیونٹی کیلئے ایسا محور بنائیں جہاں بچے سماجی پروگراموں میں حصہ لیں۔ یہ مراکز ہمارا ہیلتھی لیونگ سنٹر کی طرز پر قائم ہوں جہاں حسیب حسین پہلی بار محمد صدیق خان سے ملا تھا۔ دریں اثنا برٹش مسلم تنظیموں جن میں فیڈریشن آف سٹوڈنٹ اسلامک سوسائٹیز، دی الفرقان اسلام ہیریٹج فاؤنڈیشن اور قیولیم فاؤنڈیشن (دہشت گردی کی مخالفت میں

قائم کیا گیا تھنک ٹینک جس کی بنیاد حزب التحریر کے سابق ارکان نے رکھی تھی) نے برطانوی اقدام کی بے مثل توضیح کی ہے جو مسلمان نوجوانوں ن کی نئی نسل کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اپنی قومی اور مذہبی شناختوں کو روبہ عمل لا سکتے ہیں۔

ان اصلاحات کی وجہ سے یورپ بھر میں مسلم یکجہتی کا نیا تصور ابھر کر سامنے آیا ہے۔ لیکن عالمی جہادازم کا مقابلہ کرنے کیلئے یہ محض پہلا موقع ہے۔ مسلمانوں کے محض مقامی سطح پر شکووں شکائتوں کا ازالہ کافی نہیں۔ عالمی سطح کے شکوے، شکائتیں مقامی مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو دور کرنے کے اقدامات بھی کئے جائیں۔ اس سلسلے میں امریکہ جو دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور معاشی اور فوجی قوت ہے، اسلام اور ''مغرب'' کے درمیان موجودہ تعلق کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ بات محض اس لئے صحیح نہیں ہے کہ چونکہ امریکہ، فوجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی طور پر ایک طرف یورپ اور شمالی امریکہ اور دوسری طرف مسلمان اکثریتی ریاستوں کے درمیان تنازعہ کے حوالے سے صف اول میں موجود ہے بلکہ امریکہ عقیدے اور ضمیر کی آزادیوں کی جن کے لئے دنیا کے تمام لوگ جدوجہد کرتے ہیں، مجسم علامت بھی ہے۔ اس حوالے سے عالمی جہادازم کے خلاف بذات خود امریکہ ایک انتہائی طاقتور ہتھیار ہے۔

امریکہ میں عمومی طور پر مسلمان شناخت اور یکجہتی کے ان مسائل سے کیوں دوچار نہیں ہیں جن کا سامنا یورپی مسلمان آبادیوں کو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی وجہ اقتصادی حالات ہیں جو بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یورپ کے مسلمانوں کا تعلق مفلس اور نادار خاندانوں سے ہے جبکہ امریکہ میں بسنے والے اکثریتی مسلمانوں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ امریکہ کے ایک مسلمان گھرانے کی آمدنی غیر مسلم خاندان کی آمدنی سے کچھ زیادہ ہے اور امریکی مسلمانوں میں تعلیم کی شرح دوسرے تارکین وطن کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک نے اپنے اندر مختلف ثقافتوں، مذاہب اور نسلی گروہوں کو پوری طرح سمویا ہے اور یہی وہ فرق ہے جس نے امریکی مسلمانوں کے طرز احساس کو شکل دی ہے۔ جمہور کا مطالعہ کرنے والے یعنی ڈیمو گرافروں کے مطابق امریکہ جو پہلے ہی روئے زمین پر مختلف نسلوں، زبانوں اور مذاہب کا ملک ہے، بہت جلد ایسا واحد ملک بن جائے گا جہاں اقلیتیں اکثریت کی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔

لیکن امریکی مسلمانوں کو اپنے عقیدے اور روایات کو امریکی زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ

ہم آہنگ کرنے میں سب سے اہم عنصر امریکہ کا وہ مرکزی تصور ہے کہ مذہبی اور قومیتی شناختوں کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے اس عہد نے کہ ملک میں ہر فرد کو مذہب کے چناؤ اور عقیدے کے اظہار کی آزادی ہوگی، امریکی مسلمانوں کو جہاد ازم کی طرف جانے سے روک رکھا ہے۔ جبکہ یورپ میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔ یہی وہ آزادی ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو امریکہ کی طرف کھینچتی ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ کے دورے کے دوران مجھے یہ ذاتی تجربہ ہوا کہ امریکہ ایسے اسفنج کی طرح ہے جو ہر قسم کے عقیدے، ثقافت یا نسل کو اپنے اندر بڑی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ میں نے تہران کی سڑکوں پر مسلمانوں کو ''امریکہ مردہ باد'' کے نعرے لگاتے سنا ہے، لیکن یہی لوگ تنہائی میں مجھ سے امریکی ویزا کے حصول میں مدد کے خواہاں تھے۔ باوجود اس کے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ نے مسلم دنیا میں امریکہ کے خلاف زہر پھیلنے کے باوجود امریکی ناقدین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس قدر مذہبی آزادی امریکہ میں ہے، اس کا تصور کسی دوسرے ملک اور خصوصاً مسلمان ملکوں میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس امریکی تجربے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ثقافتی و مذہبی ہم آہنگی اور جمہوریت، خودمختاری اور قانون کی علم داری امریکی خارجہ پالیسی کا محور ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو یہ ایسا ہی رہے گا۔ بالکل اسی طرح حماس، حزب اللہ اور مسلم برادر ہوڈ جیسے اسلامی گروہوں کے ساتھ بھی اسی سوچ کے ساتھ نپٹا جانا چاہیے۔ ان گروپوں تک رسائی یقیناً ایک بے حد مشکل کام ہے لیکن آخر کار یہی واحد راستہ ہے جس کے ذریعے امریکہ خود کو ''اقوام میں موجود روشنی'' کی حیثیت سے منوا سکتا ہے۔

☆☆☆

باب ہفتم

درمیانی راستہ

قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی اپنے خشک اور بدہیئت اڑوس پڑوس کے باوجود، بے حد خوبصورت جگہ ہے جس کی تزئین و آرائش کا بیان کافی حد تک امکان سے باہر ہے۔ امریکن یونیورسٹی میدان تحریر یا آزادی چوک کے عین درمیان میں واقع ہے۔ اس یونیورسٹی کو دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے آپ کسی مختلف دنیا میں آ گئے ہوں۔ یہ یونیورسٹی پرہجوم قاہرہ سے بالکل کٹے ہوئے علاقے میں ہے۔ یونیورسٹی کی انتہائی مضبوط و مستحکم چار دیواری کے اندر مصر کے دولت مند لوگوں کے بچے اور بچیاں مغربی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ (یہ سکول ۱۹۱۹ء میں امریکیوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو عام کرنے کیلئے ہی قائم کیا تھا)۔ اس یونیورسٹی میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے غیر ملکی بھی داخلہ لیتے ہیں۔ میں نے بھی ۹/۱۱ کے حملوں کے بعد موسم گرما میں عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کیلئے داخلہ لیا تھا۔ اس وقت تک امریکی فوجی طلبہ میں یہ تعلیمی ادارہ بے حد مقبول ہو چکا تھا جو دشمن کی زبان پر کسی حد تک مہارت حاصل کرنے کیلئے قاہرہ کا سفر کرتے تھے، یہاں پر مستقبل قریب کے فوجی یہ تربیت حاصل کرنے کیلئے داخلہ لیتے تھے کہ انجانوں سے خود کو کیسے متعارف کرایا جاتا ہے، مقامی کھانے کیسے کھائے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی سیکھتے ہیں کہ جب کسی کو کار سے اترنے کیلئے کہا جائے تو اسے کیسے آواز دی جاتی ہے۔ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے ہال میں بار بار یہ سیکھنا پڑتا تھا کہ ''آزادی'' کو عربی میں حریّہ کہا جاتا ہے اور اس لفظ کی ادائیگی کیسے کی جانی چاہیے۔

میں فوجی طلبہ سے دور رہنے کی کوشش کرتا رہا اس لئے نہیں کہ مجھے ان کی وجہ سے کوئی تکلیف تھی اس کے برعکس مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انہیں عربی زبان کی شدھ بدھ ہونے کے بعد ہی اسلام کے پانچ ستونوں کے بارے میں ایک دوصفحات پر مشتمل پمفلٹ دیئے جاتے اور پھر انہیں جنگ کیلئے روانہ کیا جاتا تھا۔ تربیت کے ابتدائی چند دنوں کے دوران اگر مجھے ان میں سے کوئی ہوٹل کی لابی میں ملتا تو وہ مجھ سے صاف چادروں یا نئے تولئے دینے کیلئے کہتے۔ دراصل وہ مجھے صفائی کرنے والا لڑکا سمجھتے تھے۔ اس قسم کے چند ایک واقعات کے بعد انہوں نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور میں نے بھی انہیں اسی سکے میں جواب دیا۔

یونیورسٹی کلاسوں میں کام تو زیادہ نہیں تھا لیکن اس دوران یونیورسٹی کیفے میں مجھے بے روزگار مصریوں کے ساتھ بیٹھنے کا بہت زیادا تفاق ہوا۔ ہم لوگ ایک رنگدار چھتری کے نیچے بیٹھتے۔ چائے کی چسکیاں لیتے اور سورج اپنا سفر جاری رکھتا۔ ان محفلوں میں افغانستان کی جنگ کے سوا کوئی بات نہ ہوتی۔ ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ یہ جنگ عراق تک جائے گی اور ''اسلام کے خلاف صلیبی جنگ'' لڑی جائے گی۔ ہر میز پر یہی گفتگو ہوتی لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ مجھ پر توجہ نہ دیتے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید میں ایک معصوم سا شخص ہوں جو اس جنگ میں پھانسا گیا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ میں اس گفتگو میں شریک ہوا اور اپنی صاف ستھری عربی زبان میں سوال کر لئے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے میرے سوالوں کا جواب فرانسیسی یا انگریزی میں دیا گیا اور وہ بھی طنزیہ انداز میں۔ انہیں کیسے معلوم تھا کہ امریکی ہوں؟

میں نے ایک بُنی ہوئی چندیا پر رکھی جانے والی ٹوپی پہنی اور دھوپ سے بچنے کیلئے گہرے رنگ والا چشمہ لگانا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید میری شناخت میری آنکھوں سے ہوتی ہے اور انہیں چھپا کر ہی میں ان گفتگوؤں میں شریک ہوسکتا تھا۔ میری سیاہی مائل رنگت اور وہاں کے مروجہ لباس کے باوجود یہ لوگ جان جاتے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ (ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکی مجھے عرب سمجھتے تھے اور عرب مجھے امریکی سمجھتے تھے)۔ آہستہ آہستہ مجھ پر کھلا کہ میرے ملک نے انہیں ایسا ہی الٹی میٹم دیا تھا جیسا انہوں نے مجھے دیا اور وہ یہ کہ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہو تو پھر تم دہشت گردوں کے ساتھ ہو۔ ان کی وفاداری یا سیاسی ترغیبات جیسی بھی تھیں، وہ امریکہ اور اس علاقے میں اس کی پالیسیوں کے حوالے سے خوش نہیں تھے۔ وہ القاعدہ اور اس کے نفرت انگیز اور

مکروہ اقدامات سے سخت نالاں تھے لیکن ایک بات بڑی واضح تھی کہ ''وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے''۔

یونیورسٹی میں، جہاں زیادہ تر گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی، آنجہانی سیموئیل ہنٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو'' پر بات ہوتی۔ اگرچہ یہ کتاب کئی برس پہلے شائع ہوئی تھی لیکن قاہرہ میں اس کی فروخت حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں کہا تھا کہ اکیسویں صدی میں خصوصاً مغرب اور اسلامی دنیا میں، ہونے والے تصادم کی بنیادی وجہ نہ تو نظریاتی ہوگی اور نہ ہی اقتصادی بلکہ یہ تہذیبوں کے درمیان تصادم ہو گا۔ ''تہذیبوں کی ظاہری ہیئت کے درمیان موجود نقائص ہی مستقبل میں جنگ کا سبب بنیں گے''۔ یہ بات اس نے ۹/۱۱ کے حملوں سے کم و بیش دس برس قبل کہی تھی۔

یونیورسٹی کے مصری طلبہ اس کتاب کو بے حد پسند کرتے تھے۔ اس پسندیدگی کی کوئی اور وجہ ہو یا نہ ہو، لیکن وہ ہنٹنگٹن کی اس بات پر بے حد خوش تھے کہ اس نے اپنے تصورات عالمی تصادم میں اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب کے برابر جگہ دی تھی۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھے کہ ہنٹنگٹن نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ جہادیوں کے اس نظریے کی تصدیق کرتا ہے جس کا پرچار وہ برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں الجزیرہ ٹی وی کے ایک رپورٹر سے بات کرتے ہوئے اسامہ بن لادن نے کہا تھا کہ ''یہ (تہذیبوں کا تصادم) بڑا واضح معاملہ ہے۔ اس کی تصدیق قرآن پاک اور رسول اکرم ﷺ کی روایات سے بھی ہوتی ہے اور کوئی بھی جو خود کو مذہب اسلام کا ماننے والا کہتا ہے، ان سچائیوں پر شک نہ کرے چاہے دوسرا کوئی ان کے بارے میں کچھ بھی کہے''۔

امریکہ میں ہنٹنگٹن کا نظریہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی فلسفیانہ بنیاد بنا۔ امریکی ۹/۱۱ کے واقعات کو ایک ایسا ڈرامہ قرار دیتے تھے جو آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے اور جس میں ہر تاریخی اداکار کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ یہ ایسا ڈرامہ تھا جو امریکی نفسیات سے لگا کھاتا تھا اور جس کا آغاز سوفوکلیس کے ڈرامے کی تمہید سے ہوا تھا یعنی دو ان دیکھی قوتیں ''اسلام'' اور ''مغرب'' جو تباہ کن لیکن ناگزیر تصادم کی طرف تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی ہیں اور یہ خدا کی طرف سے بہت پہلے لکھ دیا گیا تھا لیکن انسانی آنکھ سے پوشیدہ تھا لیکن اب وہ تیز تر روشنی اور آواز میں سٹیج پر اچانک نمودار ہو گئے ہیں۔

ان میں سے چند ایک نے اس مجہول تھیوری پر بنیادی سوالات کئے۔ مثال کے طور پر

''اسلامی تہذیب'' سے کیا مراد ہے (یا مغربی تہذیب کا کیا مطلب ہے؟)؟ کیا یہ عرب دنیا کی ثقافتی روایات کا حوالہ ہے، وہ عرب دنیا جس کی آبادی دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی آبادی کا صرف دس فیصد ہے؟ شاید اس کا مطلب وہ قدیم ایرانی تہذیب ہے جو رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے ایک ہزار سال پہلے بھی موجود تھی اور جو عرب تہذیب سے خال خال ہی ملتی ہے؟ یا یہ منگول سلطنت کا حوالہ ہے جس نے تیرہویں صدی میں پورے مشرق وسطیٰ کو ہڑپ کر لیا تھا؟ یا اس سے مراد ترکی کی سلطنت عثمانیہ تھا جس کے رسم ورواج اور اس میں پیدا ہونے والے تصورات کی پیروی مسلمان دنیا سات صدیوں تک کرتی رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی تہذیب کو ''اسلامی تہذیب'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اصطلاح کسی خاص ثقافتی، سماجی یا ریاستی حکومت کی شناخت نہیں کرتی اور نہ ہی مختلف ملکوں کے مسلمان لوگوں کی پہچان بنتی ہے۔ اس کے قطعی کوئی معنی نہیں ہیں۔ یہ محض ایک انوکھا یا اجنبی تصور ہے جو ایک تصوراتی ''مغربی تہذیب'' کے مقابلے میں اختراع کیا گیا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ''اسلامی تہذیب'' کی اصطلاح ''مغربی تہذیب'' کے تصور کے مقابلے میں اختیار کی گئی ہے۔ اگر ''اسلامی تہذیب'' کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے تو وہ ہے ''اسلام'' بالکل اسی طرح جیسے ''مغربی تہذیب'' عیسائیت کی علامت ہے یا عیسائیت کا پیرائیہ اظہار ہے۔ خود ہنٹنگٹن نے اسے تسلیم کیا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف ''یہ اسلام ہے'' میں لکھا ہے کہ ''مغرب کے لئے ظاہری مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے''۔

مراکش سے ملائشیاء تک عرب اور مسلمان دنیا کی بے شمار تہذیبیں تاریخی حوالے سے یکساں طور پر ناگزیر دشمن سمجھی جاتی ہیں، یہ تہذیبوں کا تصادم ہی ہے جس نے جہادازم کے خلاف جدوجہد کو نظریاتی تقویت فراہم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو اسلام کے خلاف جنگ سمجھا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسے کبھی بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں سمجھا گیا۔ اگر دہشت گردی کے خلاف جنگ ہوتی تو پھر اس جنگ میں سپین کے علیحدگی پسند باسک، مشرقی تیمور میں عیسائیوں کی بغاوت، سری لنکا کے ہندو مارکسسٹ تامل ٹائیگرز، مشرقی ہندوستان کے ماؤسٹ، اسرائیل کی خفیہ تنظیم یہودی کچ اینڈ کہان، آئرش ری پبلکن آرمی، پنجاب کے سکھ علیحدگی پسند، مارکسسٹ مجاہدین خلق، کُرد کی پی کے کے وغیرہ کو بھی

دہشت گردوں میں شمار کیا جاتا۔ درحقیقت یہ جنگ ایک خاص قسم کی دہشت گردی کے خلاف ہے، جو خصوصی طور پر اسلامی شناخت کے خلاف ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظریاتی تصادم میں جس کو دشمن قرار دیا گیا ہے وہ دشمن صرف ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ پر حملہ کرنے والے افراد ہی نہیں یا ان کی حمایت کرنے والی تنظیمیں نہیں بلکہ دشمنوں کی اِس صف میں فلسطین کی حماس، لبنان کی حزب اللہ، مصر کی مسلم برادر ہوڈ، ایران کی مذہبی حکومت، عراق کے باغی سنی، چیچین کے باغی، کشمیر کے انتہا پسند، طالبان اور ہر وہ تنظیم شامل ہے جو خود کو مسلمان کہتی ہے اور دہشت گردی کو بطور چال یا بطور حکمت عملی استعمال کرتی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اعلیٰ ترین بیانیہ کے مطابق سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جن کا ایجنڈا مشترکہ ہے اور جن کی نظریاتی وابستگی ایک جیسی ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ گروہ آپس میں میں بھی لڑتے ہیں اور وہ مغرب سے زیادہ ایک دوسرے کو اپنے لئے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کے آپس میں ایسے اختلافات ہیں جنہیں دور کرنا ممکن نہیں سیاسی سوچ اور مذہبی عقیدوں کے حوالے سے وہ ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے ہیں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سے قبل وہ کسی بھی جنگ میں امریکہ کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔

اس میں حیرت کی بات نہیں کہ پوری دنیا میں رہنے والے مسلمانوں میں سے اسّی فیصد اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ کا مقصد اسلامی دنیا کو کمزور اور تقسیم کرنا ہے۔ جبکہ دو تہائی مسلمانوں کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بنیادی مقصد علاقے میں عیسائیت کو فروغ دینا ہے۔ دنیا بھر کی ہر مسلمان اکثریتی ریاست میں امریکہ کے بارے میں کبھی مثبت سوچ نہیں ابھر سکی۔ دلچسپ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑے قریبی حلیف مسلمان ملکوں میں بھی امریکہ کے بارے میں منفی سوچ پائی جاتی ہے۔ پیو گلوبل ایٹی چیوڈز پراجیکٹ نے ۲۰۰۶ء میں جو رائے شماری کرائی اس کے مطابق ۷۰ فیصد مصری، ۷۰ فیصد انڈونیشی، ۷۳ فیصد پاکستانی، ۸۵ فیصد اردنی اور ۸۸ فیصد ترک (یہ تمام امریکی حلیف ہیں) امریکہ کے بارے میں مثبت رائے نہیں رکھتے۔ اگر دہشت گردی کے خلاف جنگ نظریاتی ہوتی تو پھر جنگ میں شکست کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

اس کو اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ۲۰۰۵ء میں اس وقت کی امریکی وزیر خارجہ کانڈولیزا رائس نے مصر کا دورہ کیا۔ وہ قاہرہ میں امریکی یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان کھڑی

ہوئیں اور حیران کن اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ساٹھ برسوں تک میرا ملک امریکہ مشرق وسطیٰ کے اس ملک میں جمہوریت کی قیمت پر استحکام لانے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو ہم استحکام لا سکے اور نہ ہی جمہوریت قائم کر سکے۔ اب ہم ایک نیا راستہ اختیار کرنے جا رہے ہیں۔ ہم عوام کی جمہوری خواہشات کی حمایت کر رہے ہیں''۔ یہ ایک قابل تعریف بیان تھا جو مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکہ کی پچاس سالہ پالیسی کے منہ پر تھپڑ تھا۔

رائس خارجہ پالیسی کے اصولوں کو ایک ڈھیلے ڈھالے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھیں جسے ''دی بش ڈاکٹرین'' کا نام دیا گیا۔ اس میں بہت سے اصول اور تجاویز شامل تھیں (مثال کے طور پر جنگ کو روکنے کا اصول) اس کا مقصد یہ تصور اجاگر کرنا تھا کہ ''امریکہ کی پالیسی ہر ملک اور کلچر میں جمہوری تحریکوں اور اداروں کی حمایت اور اس کے فروغ پر مبنی ہوگی اور اس کا حتمی مقصد اس دنیا سے ظلم و تشدد کو ختم کرنا ہوگا''۔ خود بش نے اپنے دوسرے افتتاحی خطاب میں اعلان کیا تھا کہ ''ظلم اور مایوسی کی دنیا میں رہنے والوں کو جاننا چاہیے کہ امریکہ آپ پر ہونیوالے مظالم کو نظر انداز نہیں کرے گا یا آپ پر ظلم کرنے والوں کو معاف نہیں کرے گا۔ جب آپ اپنی آزادی کے حصول کیلئے کھڑے ہوں گے تو ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے''۔

مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کو فروغ دینا نہ تو کوئی نیا تصور تھا اور نہ ہی نئی اختراع۔ ماضی کی حکومتیں اس پورے علاقے میں سیاسی اور سماجی اصلاحات پر زور دیتی رہی ہیں لیکن بش کی بات سے یوں لگتا ہے جیسے وہ مکمل تبدیلی کی بات کر رہا تھا جس کے تحت جمہوریت کا فروغ ایک ایسی بنیاد فراہم کرے گا جس پر امریکہ اور مسلم دنیا کے درمیان تعلقات استوار ہوں گے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ امریکہ اور بیرونی دنیا میں بش کا مضحکہ اڑایا گیا۔ زیادہ تر امریکی ذرائع ابلاغ نے جمہوریت سے متعلق بش کے خطاب کو مسترد کرتے ہوئے قرار دیا کہ اس کا مقصد عراق پر حملے کے لئے قانونی جواز پیدا کرنا تھا۔ عرب پریس نے بھی بش کے جمہوری منصوبے کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے منافقانہ قرار دیا اور یہ کہا گیا کہ ''آزادی'' اور ''غلامی سے نجات'' کی آڑ میں پوری مسلم دنیا میں ختم نہ ہونے والی جنگ شروع کرنا اس کا مقصد ہے۔ جمہوری اصلاحات کے لئے جدوجہد کرنیوالوں، جو جبر کا شکار ہیں، قید میں ہیں یا جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں، کے ساتھ کھڑے ہونے کا بش کا وعدہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے کہ جن مصلحین کا ذکر بش نے کیا

ہے، وہ تو امریکہ کے حواری آمروں جن میں مصر، اردن، سعودی عرب اور مراکش شامل ہیں، کے ہاتھوں ہی ظلم و جبر کا نشانہ بنے ہیں اور بن رہے ہیں۔ اور یہ وہ ممالک ہیں جنہوں نے مغربی طاقتوں کو یہ یقین دلانے میں بیسیوں برس صرف کئے ہیں کہ ان کی آمرانہ حکومتوں میں آنے والی ذرہ برابر کمزوری پورے مشرق وسطیٰ کو انتہا پرست اسلام پسندوں کے حوالے کر دے گی۔

اس کے باوجود بش انتظامیہ نے اس معاملے میں آگے کی طرف قدم بڑھایا اور مصر کے صدر حسنی مبارک (جو انور السادات کے بعد صدر بنے) پر دباؤ ڈالا کہ پارلیمانی انتخابات میں مسلم برادر ہود (جس پر پابندی عائد تھی) کے ارکان کو حصہ لینے کی اجازت دے۔ (حسنی مبارک نے مصر میں پہلے صدارتی انتخابات کرانے پر بھی رضامندی ظاہر کر دی اس کے علاوہ اس نے مخالف سیاسی شخصیت ایمن نور کو اپنے مقابلے میں انتخاب لڑنے کی اجازت بھی دی) امریکی انتظامیہ نے لبنانی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ انتخابات کرائے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں حزب اللہ کے لئے حکومت میں ایک بڑا کردار ادا کرنے کے موقع فراہم ہوا۔ لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ امریکی انتظامیہ نے فلسطینیوں کو پہلی بار یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آزادانہ اور شفاف انتخابات کے ذریعے اپنے سیاسی رہنما منتخب کریں۔

کچھ وقت تک تو یوں لگا جیسے سیاسی ریت پورے مشرق وسطیٰ میں ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے ایسے خطے میں جہاں جمہوریت کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا، وہاں اقتدار شخصی حکمرانوں سے جو طویل مدت سے اقتدار پر قابض تھے، اب وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا تھا۔ یہ بات ''دی اکانومسٹ'' کے ایک شمارے میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ امریکہ کے بارے میں عمومی شکوک وشبہات اور جارج ڈبلیو بش کے لئے شدید نفرت کے باوجود عرب ملکوں کے گلی محلوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ امریکہ اور مسلم دنیا کے تعلقات کے حوالے سے ایک نئی کہانی جنم لے رہی ہے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے امریکہ صلیبی جنگجو نہیں بلکہ مفلسوں اور بے بسوں کے حقوق کا چیمپئن ہو۔ پورے علاقے کی بہت بڑی اکثریت نے تجزیہ نگاروں کو بتایا کہ انہیں یقین تھا کہ امریکہ حقیقی معنوں میں مسلم دنیا کو جمہوریت کی طرف جاتے دیکھنا چاہتا تھا۔ صدر کی دوسری افتتاحی تقریر کے چند ماہ بعد گیلپ انٹرنیشنل پر منکشف ہوا کہ مشرق کے ۷۸ فیصد لوگ جمہوریت کو بہترین طرز حکومت سمجھتے ہیں۔ ایک سال بعد ۲۰۰۶ء میں

پیو پول نے انکشاف کیا کہ مغربی ممالک کے لوگوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ جمہوریت ایک مغربی طرز زندگی ہے جو زیادہ تر مسلم ممالک میں قابل تقلید نہیں ہوگی۔ لیکن ہر ایک مسلم ملک میں جو سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان مسلم ملکوں کے لوگوں نے یورپی لوگوں کی اس دلیل کو رد کر دیا اور اپنے ہاں جمہوریت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ الجزائر، یمن، تیونس، بحرین، اردن، مراکش، یہاں تک کہ سعودی عرب میں بھی جمہوریت کی لہر چلی جس کی وجہ سے ان آمرانہ حکومتوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن لوگوں نے شخصی حکومتوں کے تحت زندگیاں گزاری تھیں انہیں موقع ملا کہ وہ اپنی پسند کے نمائندوں کو منتخب کریں اور اس طرح انہوں نے اپنے لئے نئی منزلوں کے راستے کھولے۔

ان انتخابات کے نتائج بے حد حیرت انگیز تھے۔ لبنان میں حزب اللہ نے پارلیمنٹ میں چودہ نشستیں حاصل کیں جبکہ گذشتہ انتخابات میں حزب اللہ نے گیارہ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کابینہ میں دو وزارتیں بھی ملیں۔ اردن میں اسلامک ایکشن فرنٹ نے جو مسلم برادر ہوڈ کی ایک شاخ تھی، پارلیمنٹ میں پندرہ فیصد نشستیں جیت لیں۔ اسی طرح فلسطین میں حماس نے اپنی سیاسی مخالف جماعت الفتح کو بری طرح شکست سے دوچار کیا اور فلسطینی اتھارٹی کا کنٹرول سنبھال لیا۔

مصر میں صورتحال عجیب تھی۔ عرب دنیا کے اس ثقافتی مرکز اور اس ملک میں جہاں کونڈالیزا رائس نے پہلی بار بش ڈاکٹرین کا اعلان کیا تھا، جمہوریت کے فروغ کے تجربہ کو سخت آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ مبارک کی سیکورٹی فورسز نے شدید جبر و تشدد کیا۔ ووٹروں کو مارا پیٹا گیا، ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ پولنگ بوتھ بند کر دیئے گئے اور چن چن کر حزب اختلاف کے رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ مسلم برادر ہوڈ کے ارکان کو جو آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ لے رہے تھے، گرفتار کر لیا گیا لیکن اس سب کچھ کے باوجود مصر کی پارلیمنٹ کی ۴۴۴ نشستوں میں سے ۸۸ نشستیں حسنی مبارک کے مخالفوں نے حاصل کر لیں اور یوں مسلم برادر ہوڈ ملک کی پہلی جائز حزب اختلاف کے طور پر سامنے آئی۔

مراکش اور ترکی کی اسلام پسند جماعتوں کی طرح جن پر حکومت کی طرف سے سیاست کرنے کی ممانعت تھی، حکومت میں شامل ہونے کا سفر جس طرح طے کیا، مصر کی مسلم برادر ہوڈ نے بھی اپنی ذمہ داریوں کا فوری احساس کرتے ہوئے ویسا ہی طریقہ اختیار کیا یعنی کہ (باہر بیٹھ کر

مخالفت کرنے کی بجائے) حکومت کا حصہ بن جایا جائے تا کہ انقلابی نظریات کے فروغ کا راستہ اگر بند نہیں کیا جا سکتا تو اسے تنگ ضرور کر دیا جائے۔ چنانچہ مصر کو مذہبی ریاست میں تبدیل کرنے کی بجائے، جیسا کہ پورے علاقے کے عرب حکمران بار بار متنبہ کر رہے تھے، مسلم برادر ہوڈ نے پارلیمنٹ میں لبرل دانشوروں اور سیکولر جمہوریت پسندوں کو سیاسی شراکت دار بننے کا موقع فراہم کیا۔ برادر ہوڈ کے ارکان پارلیمنٹ نے وسیع تر سیاسی آزادیوں، جن میں مذہبی آزادی، اجتماع کرنے کی آزادی، آزادی تقریر و تحریر شامل ہیں، کے حوالے سے حکومت کے ساتھ گفت و شنید کی۔ انہوں نے حزب اختلاف کے دوسرے گروپوں کے ساتھ الحاق بنائے۔ یہاں تک کہ حسنی مبارک کی اپنی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے ارکان سے بھی مشاورت کی تا کہ تیس سال سے مسلط ایمرجنسی رول سے نجات حاصل کی جا سکے۔ جو سادات کے قتل کے بعد نافذ کی گئی تھی اور جس نے حسنی مبارک کو آہنی طاقت کے ساتھ حکمرانی کرنے کا راستہ دیا تھا۔ ان اقدامات نے پہلی بار تصلب زدہ مصری پارلیمنٹ کو ایک حقیقی قانون ساز ادارے کے مماثل بنا دیا۔ رفتہ رفتہ مسلم برادر ہوڈ نے اپنے ناقدین کو اس بات پر راضی کر لیا کہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے تو وہ مصری سیاست میں ایک جائز سیاسی قوت کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ اور یہی وجہ تھی جس نے حسنی مبارک کو مجبور کر دیا کہ وہ پولیس سٹیٹ کی تمام تر قوت کو مسلم برادر ہوڈ کے خلاف بہیمانہ طور پر استعمال کرے۔

اپنی قوت کو مستحکم کرنے اور مسلم برادر ہوڈ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو نقصان پہنچانے کے لئے حسنی مبارک نے انتہائی جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے۔ اس نے میونسپل انتخابات منسوخ کر دیئے، پارلیمنٹ کے ذریعے آئینی تبدیلیاں مسلط کرنے کی کوشش کی (باوجود اس کے برادر ہوڈ اور اس کی حامی جماعتوں نے سختی سے اس حوالے سے پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کیا) ہزاروں وکلاء ججوں، صحافیوں اور سیاسی مخالفوں کو گرفتار کر لیا، گرفتار ہونیوالوں میں لبرل ڈیموکریٹ ایمن نور بھی شامل تھے جنہوں نے حسنی مبارک کے خلاف صدارتی انتخاب لڑا تھا اور ان سب کو جیلوں میں بند کر دیا۔

دنیا سانس روکے انتظار کر رہی تھی کہ صرف حسنی مبارک کے ان اقدامات پر ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں تیزی کے ساتھ آنیوالی سیاسی تبدیلیوں پر امریکہ کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ حماس اور حزب اللہ جیسے عسکری گروپوں کو تسلیم کرنے کے حوالے سے امریکہ اور پوری دنیا کے سیاسی رہنماؤں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے وہ قابل فہم تھے اس لئے کہ ان گروپوں کی

نظریاتی پالیسیاں اس علاقے میں امریکی مفادات کے صریحاً متضاد تھیں۔ بہرحال ایک سوچ یہ بھی تھی اگر مسلم برادر ہوڈ خود کو ایک مخالف تحریک سے سیاسی جماعت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے تو شاید وہ دوسرے اسلام پسند گروپوں کے لئے ایک مثال بن سکے، جس نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے ہتھیار پھینک کر انتخابات کا راستہ اختیار کیا تھا۔

وہ جواب جس کا پوری دنیا انتظار کر رہی تھی، اگلے برس ۲۰۰۶ء میں اس وقت سامنے آیا جب امریکی وزیر خارجہ رائس نے قاہرہ کا دورہ کیا۔ مبارک کے ساتھ کھڑے ہوکر اس نے حسنی مبارک کی ''جمہوری'' اصلاحات کی تعریف کی لیکن اپنی گفتگو میں انتخابات کے انعقاد کی منسوخی اور مبارک کے مخالفوں کی گرفتاریوں کے بارے میں ایک بھی لفظ نہ کہا۔ بعد میں جب رائس واپس واشنگٹن روانہ ہوئی تو مبارک نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ ''امریکی وزیر خارجہ نے مشکل مسائل پر گفتگو نہیں کی، نہ تو اس نے کچھ تبدیل کرنے کو کہا اور نہ ہی سیاسی اصلاحات کے معاملے میں مداخلت کی۔ مصر میں ہونے والی سیاسی اصلاحات اور جمہوریت کے نفاذ پر وہ مطمئن تھی۔'' درحقیقت کونڈالیزا رائس صرف ایک مقصد کیلئے قاہرہ آئی تھی اور وہ مقصد حسنی مبارک کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ حماس کو ملنے والی امداد کو ختم کرنے کیلئے مصر، یورپ، امریکہ اور اسرائیل کا ساتھ دے تاکہ فلسطین میں حماس کو اقتدار سے طاقت کے ذریعے نکالا جاسکے۔

پیغام بڑا واضح تھا۔ لبنان اور فلسطین میں جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے رہنماؤں کو سیاسی عمل میں شرکت سے انکار اور اردن، مصر، مراکش اور سعودی عرب میں اپنے حامیوں کی طرفداری کے نتیجے میں ان کے جابرانہ رویے میں شدت آگئی۔ اس طرح امریکہ دنیا کو یہ بتا رہا تھا کہ جمہوری طریقے کے ذریعے پرامن سیاسی اصلاحات کا وعدہ ایک جھوٹ تھا، فریب تھا۔ جیسا کہ ثابت ہوا کہ یہی وہ پیغام تھا جس کا اعلان ایمن الظواہری نے مسلم دنیا کو اپنی تقریر میں ویڈیو ٹیپ کے ذریعے دیا تھا۔ ایمن الظواہری نے مسلم برادر ہوڈ، حماس، حزب اللہ اور دوسرے اسلامی گروپوں کو امریکہ پر بھروسہ اور اعتماد کرنے پر ان کی لعن طعن کی تھی۔ اس کے علاوہ انتخابات میں حصہ لینے پر بھی ان کے لتے لئے تھے۔ ظواہری نے دنیا بھر میں بکنے والے کتاب ''دی برہارویسٹ، دی بٹر ادر ہوڈ ان سکسٹی ایئرز'' (The Bitter Harvest: The Brother hood in Sixty years) میں لکھا ہے کہ ''ہر وہ شخص کفر کے نظام یعنی جمہوریت کی نمائندگی

کرتا ہے لیکن اسلام کا نام لیتا ہے، کافر ہے''، جو کوئی خود کو جمہوریت پسند مسلمان کہتا ہے یا وہ مسلمان جو جمہوریت کی بات کرتا ہے، کافر ہے''۔

یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ جمہوریت کے تجربے نے، جسے گذشتہ چند برسوں میں بے ڈھنگے پن سے کیا گیا تھا، پورے مشرق وسطیٰ میں محض امریکہ ہی نہیں بلکہ خود جمہوریت کے خلاف شدید ردعمل پیدا کر دیا تھا۔ لفظ جمہوریت کو بش انتظامیہ کی کھلی منافقت اور سفارتی بھونڈا پن کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ لیا جانے لگا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ دراصل کائناتی جنگ ہے۔ اس کی وجہ وہ غصہ اور احساس تھا جو افغانستان اور عراق کی لڑی جانے والی جنگوں میں انسانی جانوں کے ضیاع کی وجہ سے پیدا ہوا۔ القاعدہ کے عسکریت پسندوں کا پیچھا کرنے کا مطلب امریکی اقدار کی توہین، آزادی اور حق خود اختیاری کی حمایت کے امریکی وعدوں سے مکرنا لیا جاتے لگا۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ مشرق وسطیٰ میں سماجی اصلاحات محض ڈھونگ تھیں۔ اس خطے میں کے اکثر لوگ جمہوریت کا مطلب انتشار، افتراق اور تصادم سمجھنے لگے اور یہ کہا جانے لگا کہ امریکہ کا مقصد محض حکومتی تبدیلی ہے۔

سابقہ امریکی انتظامیہ کی پالیسیوں نے صرف جہادازم کو مستحکم کیا اور جہادازم کی پسندیدگی کو خصوصاً مسلمان نوجوانوں میں فروغ دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کو کچھ نیا کرنے کا موقع بھی فراہم ہوا۔ چنانچہ امریکہ نے گذشتہ برسوں کی بندشوں سے جان چھڑائی اور انتہا پسند اسلام کے خلاف نظریاتی آویزش کی تشکیل نو کی۔ جارج ڈبلیو بش نے دنیا کو قطعی الٹی میٹم کہ یا ''تم ہمارے ساتھ ہو یا پھر تم دہشت گردوں کے ساتھ ہو'' دینے کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے چند روز بعد متنبہ کیا کہ ''اس تصادم میں کوئی غیر جانبدار نہیں ہے''۔ لیکن بارک حسین اوباما کے انتخابات نے مشرق وسطیٰ میں توازن تبدیل کر دیا اور مسلمانوں میں امریکہ کے بارے میں تصور مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔ ابتداء ہی سے، بلکہ اپنی صدارت کے پہلے لمحوں ہی سے صدر اوباما نے یہ مشن بنالیا کہ مسلم ریاستوں کے شہریوں کے ساتھ ایک دوسرے کے احترام کے حوالے سے معاملات کو سلجھایا جائے (مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ تھا کہ انہیں برابر کی سطح پر نہ سمجھتے ہوئے ان کا احترام نہیں کیا جاتا تھا)۔ اوباما نے کہا کہ ''میرا کام یہ ہے کہ میں امریکی عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کروں کہ مسلم دنیا غیر معمولی اہمیت اور اہلیت کے حامل لوگوں سے بھری

پڑی ہے جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی اپنے طور پر گزاریں اور ان کے بچے خوشحال زندگیاں بسر کریں''۔ اوباما نے ''ایک عرب نیوز چینل العربیہ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے اعلان کیا (یہ صدر بننے کے بعد اوباما کا پہلا انٹرویو تھا) کہ ''میرا کام مسلمان دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ امریکی مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں''۔

اوباما کے یہ الفاظ تہذیبوں کے تصادم والی ذہنیت کا استراد ہیں۔ ان لفظوں سے لگتا ہے کہ وہ خود کو، جو افریقہ کے ایک مسلمان باپ اور کنساس کی ایک عیسائی خاتون کے بیٹے ہیں، اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان ایک ایسے پل کی حیثیت دینے کی کوشش کر رہے ہیں جو دونوں مذاہب کو یکجا کر سکتا ہے اور ان لفظوں کے ذریعے ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن جیسے نظریاتی نظریہ ساز لوگوں کے لئے امریکی صدر کے بیان کا جواب دینا مشکل بنا دیا اس لئے کہ امریکی صدر اوباما نے فخر سے اعلان کیا تھا کہ ''میرے خاندان کے بہت سے ارکان مسلمان ہیں۔ میں مسلم ممالک میں رہ چکا ہوں''۔

صدر اوباما کی اس بات کی تعریف ضرور کرنی چاہیے کہ انہوں نے سابقہ حکومت کی کائناتی سوچ اور متضاد مذہبی تقریروں اور بیانات کو مسترد کر دیا اور اس کا مقصد دنیا کے ایک ایسے حصے کے ساتھ نئے تعلق کو قائم کرنا تھا جس کے بارے میں امریکی تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتے تھے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے فروغ کیلئے اپنے پیشرو حکمرانوں کی بے ڈھنگی، ناکام اور احمقانہ کوششوں کو ادھورا ہی چھوڑ دیں۔ جون ۲۰۰۹ء میں قاہرہ میں مسلم دنیا کو خطاب کرتے ہوئے اوباما نے فلسطینیوں کی ہر روز ہونے والی تذلیل کا بڑے جذباتی انداز میں ذکر کیا۔ فلسطینی علاقوں کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ان علاقوں کے لئے ''مقبوضہ'' کا لفظ استعمال کیا۔ یہ وہ لفظ تھا جسے اس سے پہلے کسی امریکی صدر کو بولنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے جمہوریت کا محض ذکر ہی کیا اور اسے ضمنی حیثیت دی۔ انہوں نے اس بات کو محض حوالے کے طور پر استعمال کیا کہ مسلم اکثریتی ملکوں میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تشویش انتخاب در انتخاب کے حوالے سے تھی۔ جبکہ مسلم ممالک کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ سیاسی حقوق نہ ملنے کا تھا۔ معنی خیز طور پر انہوں نے جمہوریت کے بارے میں جو چند الفاظ کہے اس پر وہاں بیٹھے لوگوں کی بھاری اکثریت نے بہت دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ صورتحال اس حقیقت کی غماز ہے کہ

جمہوریت ہی ایسا موضوع تھا جسے اوباما نظر انداز نہیں کر سکتے۔

درحقیقت صرف اس ایک مسئلہ پر صدر بش کا رویہ مثبت تھا کہ صحیح جمہوری اصلاحات کے ذریعے سے ہی انتہا پسند گروہوں کو غیر محسوس طریقے سے نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور مسلم عسکریت کی لہر کو روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کو محض خوبصورت لفظوں سے مزین تقریروں اور کھوکھلے وعدوں کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اس خطے میں امریکی کے حامی ملکوں پر سخت اور مسلسل دباؤ کی ضرورت ہو گی (اس کا مطلب وہ ممالک ہیں جو امریکہ سے اربوں ڈالروں کی اقتصادی اور فوجی امداد لیتے ہیں) تاکہ حکومت میں عوامی نمائندوں کی شرکت کے بڑھتے ہوئے عوامی مطالبے پر عمل درآمد ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ حکومتیں اپنے سیاسی مخالفوں کو خاموش کرنے کے لئے انہیں یکطرفہ طور پر سزائیں دلوا کر جیلوں میں بند کرنے سے گریز کریں ملک کو چلانے میں زیادہ سے زیادہ عوامی شرکت کو یقینی بنائیں اور اس حوالے سے خصوصی طور پر مذہبی قوم پرست گروہوں کو، جو ذمہ دارانہ طرز حکمرانی کیلئے تیار ہوں، جمہوری عمل میں شریک کریں۔ باوجود اس کے کہ بش کی جمہوریت کو فروغ دینے کی کاوش پر الزام تراشیاں کی گئیں اور یہ کہا گیا کہ ان کاوشوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ خصوصاً لبنان اور فلسطین میں تشدد میں اضافہ ہوا اور اس علاقے میں عدم استحکام بڑھ گیا لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ علاقے میں مزید جمہوریت کے ذریعے ہی سے امن قائم ہو سکتا ہے اور خوشحالی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

ایسے متلون مزاج والے علاقے میں سیاسی اصلاحات کو آگے بڑھانے میں بڑے خدشات ہوتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں اسرائیل اور لبنان کے درمیان ہونیوالی جنگ (یہ جنگ گشت کرنے والی اسرائیلی فوج پر حزب اللہ کی طرف سے ہونے والے حملے سے شروع ہوئی) اور اس کے نتیجے میں غزہ کی پٹی میں اسرائیل اور حماس کے درمیان ہونے والی جنگ درحقیقت اس علاقے میں جمہوریت کو فروغ دینے سے پیدا ہونے والے خطرات کی یاددہانیاں ہیں۔ آن لائن جریدے سلیٹ (Slate) کی شہ سرخی میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ''کیا عرب جمہوریت اسی انتشار کی مستحق ہے؟'' اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرق وسطیٰ میں صحیح جمہوری انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی کچھ حکومتوں کے نکتہ ہائے نظر اور پالیسیاں ایسی ہوں گی جو امریکی مفادات کے خلاف ہوں لیکن جب تک ان ملکوں کی آمرانہ حکومتیں اپنے عوام کے مطالبات کو نظر انداز کرتی رہیں گی

(ظاہر ہے کہ امریکہ کی منظوری کے ساتھ) تب تک مسلم برادر ہوڈ، حماس اور حزب اللہ جیسے اسلامی گروپ اپنی سماجی واقتصادی ضروریات کی طرف توجہ دیتی رہیں گی اور خطے کے عوام اسلام پسندوں کی حمایت جاری رکھیں گے اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔ یہ ایک سیاسی حقیقت ہے کہ جب انتخابات ہوتے ہیں تو ووٹ اسی کو ملتے ہیں جو گلیاں صاف کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم اسلام پسندوں کے انتخاب کو لوگوں کے لئے ناممکن بنائیں، ہمیں چاہیے کہ ہم لوگوں کو آگاہ کریں کہ اسلام پسندوں کا منتخب ہونا کتنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

بہرحال مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے فروغ میں کتنے بھی خدشات کیوں نہ ہوں، محض علاقے میں استحکام کی خاطر ان جبس زدہ سیاسی اصلاحات کو جاری رکھنے سے پہنچنے والے نقصانات کے مقابلے میں وہ بہت کمزور ہوں گے۔ دہشت گردی ان معاشروں میں پھلتی پھولتی ہے جن میں قانونی اور جائز سیاسی حزب اختلاف کے لئے جگہ میسر نہ ہونے دی جائے۔ جب آپ لوگوں کی آواز کو دبا دیتے ہیں تو اس کے نتائج منفی ہی ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے لبریشن تھیالوجی تحریک میں دیکھا کہ جب پرامن آوازوں کو خاموش کر دیا گیا تو اس کے نتیجے میں تشدد سیاسی اظہار کا واحد ذریعہ بن گیا۔ پورے مشرق وسطیٰ میں جب بھی معتدل اسلامی جماعتوں کو سیاسی عمل میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی تو اس کے نتیجے میں انتہا پسند گروہوں کو ملنے والی عوامی حمایت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس سلسلے میں ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اے کے پی) کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ اسلامی جماعت ہے لیکن لوگوں میں مقبول ہے اور اس وقت یہ ترکی میں برسر اقتدار ہے۔ اے کے پی حزب مخالف جماعت تھی جس پر پابندی عائد تھی لیکن اپنے عمل کے باعث وہ ایک طاقتور سیاسی قوت بن گئی جس نے ترکی کو معاشی تباہی سے بچایا، اسرائیل اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کو بہتر کیا اور ملک کی محکوم کُرد اقلیت کو بہت زیادہ آزادی دی اور ملک کے مزید انتہا پسند مذہبی گروہوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اس کی مثالیں گریٹ ایسٹرن اسلامک فائٹرز فرنٹ اور اسلامک لبریشن موومنٹ ہیں جن کی حمایت اب مشکل ہی سے کہیں ملتی ہے۔ اس کے برعکس جب اسلام پسند حزب اختلاف کو دبایا گیا تو عسکری گروہوں اور مذہبی انتہا پسندوں کو حمایت حاصل ہونے لگی۔ الجزائر کی خانہ جنگی ایک اہم مثال ہے جس نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں تقریباً پورے ملک کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ الجزائر کی انتہائی پرتشدد جہادی تنظیم دی آرمڈ اسلامک گروپ کا فروغ

حکومت کے اس فیصلے کا براہ راست نتیجہ تھا جس کے تحت فرنٹ اسلامک دوسالوت (ایف آئی ایس) جیسی اعتدال پسند اسلامی جماعتوں کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

دوسرے لفظوں میں اسلام ازم، جہاد ازم کے لئے ڈھال کا کام دیتا ہے۔ جہادیوں کے برعکس جن کے مقاصد اور خواہشات کا انحصار کائناتی سطح پر ہوتا ہے، اسلام پسندوں کے مادی مقاصد اور جائز خواہشات ہوتی ہیں جنہیں ریاست پورا کرسکتی ہے۔ جبکہ جہادی، سیاسی شرکت کو کافرانہ عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ پورے مشرق وسطیٰ کی کالعدم اسلام پسند جماعتوں نے اپنے عمل سے ظاہر کیا ہے کہ اگر انہیں سیاسی عمل میں شریک کیا جائے اور انہیں حکمرانی کا جائز طریقے سے موقع مہیا کیا جائے تو وہ ایسے ذمہ دار سیاسی اداکار بن سکتے ہیں جو انسانی حقوق کے جمہوری نظریات کے ساتھ وابستہ ہوں گے۔ خواتین کے حقوق کی پاسداری کریں گے، حکومتی احتساب کو رواج دیں گے، قانون کی حکمرانی قائم کریں گے۔ یہ پیشن گوئیاں کہ اسلام پسند جماعتوں کی انتخابی کامیابیاں جمہوریت کی موت ہوں گی اب تک غلط اور بے بنیاد ثابت ہوئی ہیں۔ درحقیقت مشرق وسطیٰ کے عوام کو زیادہ اعتدال پسند اور زیادہ انقلاب پسند اسلامی جماعتوں کے درمیان انتخاب کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ہمیشہ اعتدال پسندوں ہی کا ساتھ دیا (یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اپنے تمام تر پرتشدد اقدامات اور اشتعال انگیز تقریروں کے باوجود حماس بنیادی طور پر فلسطین کے تمام اسلامی گروپوں میں کہیں زیادہ اعتدال پسند اور روادار سیاسی جماعت ہے خاص طور پر جب اس کا مقابلہ اس کی شدید مخالف جماعت فلسطینی اسلامک جہاد سے کیا جائے)۔ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں (جسے حال ہی میں صوبہ خیبر پختونخواہ کا نام دے دیا گیا ہے) میں جو القاعدہ اور طالبان کا مرکز ہے اور جہاں کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن اور الظواہری چھپے ہوئے ہیں۔ کٹر اسلام پسند جماعتوں اور اعتدال پسند سیاسی جماعت عوامی نیشنل پارٹی کے درمیان انتخابات ہوئے تو ان میں اے این پی نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ (۲۰۰۸ء کے انتخابات)

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت محض انتخابات کا نام نہیں۔ یقینی طور پر یہ سچ ہے۔ تاہم آیئے ایک لمحے کیلئے تصور کریں کہ اگر بعض پابندیوں اور بندشوں کے ساتھ حماس کو فلسطین میں منتخب حکومت کا مقام دے دیا جاتا، جو اس کا حق تھا، تو پھر کیا ہوتا (یہ ایک مشکل کام ضرور ہوتا اس لئے الفتح کے مقابلے میں اس کی پارلیمانی کامیابی کے بعد کافی خون خرابہ ہوا) کیا یہ کوئی ناقابل

تصورعمل تھا کہ حماس اسی طرح تبدیل ہوجاتی جس طرح مصر میں مسلم برادر ہوڈ تبدیل ہوئی؟ اس حوالے سے الفتح کی مثال بھی دی جاسکتی ہے کہ پہلے جسے ایک دہشت گرد تنظیم کے طور پر لیا جاتا تھا، بعد میں اسی کو بین الاقوامی سطح پر سیاسی جماعت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا (بلکہ اسے امریکہ اور اسرائیل کی حلیف سمجھا جانے لگا)۔ امّ النصر کے دہشت ناک واقعات کا الزام اسرائیل یا امریکہ کی بجائے حماس حکومت پر لگایا جاسکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اگر حماس کو حکومت کرنے کا موقع دیا جاتا اور وہ ناکام ہوجاتی تو کیا وہ فلسطینیوں میں پہلے کی طرح مقبول رہ سکتی تھی؟ یا اگر لوگ حماس کے خلاف ہو جاتے اور اس کی نسبت الفتح جیسی کم نظریاتی، زیادہ روادار اور زیادہ موثر سیاسی جماعت کی طرف راغب ہوجاتے بالکل ویسے ہی جیسے لوگ الفتح سے مایوس ہوکر حماس کی طرف راغب ہوئے تھے تو پھر کیا صورتحال ہوتی؟ اس بات میں کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تاہم ایک بات حتمی ہے کہ انتخابات ہی جمہوریت کے قیام کی ضمانت نہیں ہوتے اور وہ بھی خصوصاً فلسطین جیسے ملک میں، اس کے باوجود اگر تسلسل کے ساتھ دوبار آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو جاتے تو یہ ایک اچھی ابتداء ضرور ہوتی۔

آخر میں اس معاملے میں آخری پسند کوئی نہیں ہے۔ یہ تصور ناممکن ہے کہ پورے مشرق وسطیٰ میں اسلام پسند جماعتوں کی فعال شرکت کے بغیر کوئی جمہوری اصلاحات ہوسکتی ہیں۔ بلکہ حماس اور حزب اللہ جیسی انتہا پسندانہ سوچ رکھنے والی جماعتوں کو بھی سیاسی عمل میں شریک کیا جانا چاہیے۔ ان کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ دونوں تنظیمیں اپنے ممالک میں سیاسی طور پر بے حد متحرک ہیں۔ ان تنظیموں کو محض ''نان سٹیٹ تشخص رکھنے والی تنظیمیں'' قرار (جبکہ فلسطین یا لبنان جیسی ریاست موجود ہے) دے کر سیاسی عمل سے باہر کرنے سے ان کی طاقت یا ان کی مقبولیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر بعض تسلیم شدہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ان مذہبی قوم پرستوں کو سیاسی عمل میں بھرپور طریقے سے شریک ہونے کی اجازت دیدی جائے تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ انتہا پسند نظریات کو مسلم برادر ہوڈ اور اے کے پی کی طرح اعتدال پسندی کے دائرے میں لے آئیں گی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ مذہبی قوم پرستی کی، چاہے وہ صیہونی ہو، مسیحی ہو یا اسلامی، ہمہ گیر اور تقویت پکڑتی ہوئی سوچ کے مطابق سرحدوں کے بغیر دنیا ناگزیر ہوچکی ہے۔ یہ کوئی بری بات

نہیں ہوگی۔ سیکولر جبریت (آمریت) اور جہادی ہٹ دھرمی (تشدد) کی انتہاؤں کے درمیان اسلام ازم ایک ایسا نکتہ ہوسکتا ہے جس پر سب کی رضامندی ہو۔ درحقیقت یہ جہادازم کا تریاق ہوگا۔

بے شک ایسے لوگ موجود ہیں جو ماضی کی کارکردگی یا مثال سے قطع نظر اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلامی اقدار پر یقین رکھنے والی پارٹی کبھی بھی جمہوری نہیں ہوسکتی۔ بہرحال اس بات کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ انڈونیشیاء ملائشیا، سینی گال، مراکش، مصر اور بنگلہ دیش میں اسلام پسند جمہوری تحریکیں کامیابی سے سیاسی عمل میں شریک ہیں۔ اس سے امید پیدا ہوتی ہے کہ مسلم دنیا میں سیاسی اصلاحات اب زیادہ دور کی بات نہیں۔

اس بنیادی سچائی کو اگر کہیں دیکھا جاسکتا ہے تو وہ ہے غزہ۔ بہرحال اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تشدد کے واقعات کو (یہ تصادم زمین اور وسائل یا خدا کے لئے لڑی جانے والی کائناتی جنگ کے طور پر) بھلے کسی بھی طور پر دیکھا جائے اور اس تصور کو کہ اسلامی گروپوں کو ذمہ دار سیاسی جماعتوں کی شکل دی جاسکتی ہے تو اس سے یہ امید ضرور پیدا ہوئی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امن کا قیام ممکن ہے۔ یہ بات بہرحال واضح ہے کہ یہ جمہوریت کے عمل کو تقویت دینے کا وعدہ نہیں بلکہ اس وعدے سے پھرنا ہے جو فلسطینیوں کی شکستگی کا باعث بنا، جس کے باعث غزہ محصور ہوگیا، حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ کا سبب بنا اور بالآخر جس کے نتیجے میں پندرہ لاکھ فلسطینیوں کی زندگیاں تباہ ہوئیں۔ اس لئے یہ جمہوریت کی تخفیف نہیں بلکہ تسلسل کے ساتھ اسکا فروغ ہے۔ آخرکار اس سے صرف فلسطین ہی نہیں بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں امن اور استحکام قائم ہوگا۔ اس کے نتیجے میں پورے خطے میں تمام جماعتوں کو سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کا موقع ملے گا جس کے نتیجے میں عالمی جہادازم کو شکست ہوگی اس لئے کہ اس قسم کی شراکت پر عائد پابندیوں اور لوگوں کی شکایات سے تحریک کو نہ صرف ہوا ملتی ہے بلکہ تحریک میں تسلسل کے ساتھ شدت پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ہر مسلمان ملک میں ایک کھلی مذہبی اور سیاسی فضا قائم کرنی چاہیے تاکہ جہادی نظریہ سازوں کو شکست ہوسکے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ، جیسا کہ ہم نے اسے یہ نام دیا ہے، ختم ہوسکتی ہے لیکن سماجی تحریک کے طور پر عالمی جہادازم کے خلاف جدوجہد اب شروع ہوئی ہے۔

اظہارِ تشکر

یہ کتاب امانڈہ فورتینی، ایان ویریٹ، مارک جوئر گنز میئر، رچرڈ ایپل بام، لزا حجر، ڈیرک شیارر، نازنین انگشتری، میگن کرسٹوفر، ول مرفی، ایلس چینی، کورٹنی ترکو، نیکول سٹیڈ، ہاوَدی سنیڈ رز اور دوسرے متعدد دوستوں کے تعاون کے بغیر تحریر نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں اس تعاون پر ان سب کا شکر گزار ہوں۔

حوالہ جات

النکبہ : تباہی۔ یہ اصطلاح اسرائیلی ریاست کے قیام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہجرت کے بحران کے لئے فلسطینی استعمال کرتے ہیں۔

الولہ، والبراء: جہادی تحریک، وفاداری اور دشمنی کے نظریہ (ڈاکٹرین) کیلئے استعمال کرتی ہے۔

خلیفہ: مسلمانوں کا سیاسی سربراہ، خلیفہ کا عہدہ مصطفیٰ کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں ختم کر دیا تھا۔

کرسچئین ازم/ڈومینین ازم: کرسچئین مذہبی قوم پرستی، مسیحت بطور سیاسی نظریہ۔

کرسچئین زائنزم: اسرائیلی، ریاست کی حمایت کرنے والے انجیلی عقائد کو ماننے والے پروٹسٹنٹ لوگوں کی تحریک۔

دارالسلام: ''سرزمین اسلام'' اسلامی حکومتوں کے زیر اثر علاقے۔

دارالکفر : کافروں کی سرزمین، وہ علاقہ جو اسلامی حکومتوں کے زیر تسلط نہ ہو۔

ایرٹز یسرائیل: انجیل میں دیا گیا اسرائیل کا نام۔

ایونجیکالزم : پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی سماجی تحریک جو برطانیہ میں اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی۔

فنڈامینٹلزم: امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی تحریک جو ۲۰ویں صدی میں شروع ہوئی۔

گلوبل جہادازم: عسکریت پسند سنی مسلمانوں کی سماجی تحریک جس کی جڑیں ۲۰ویں صدی کی عرب کی اصلاحی تحریکوں میں ہیں۔

گش ایمونم: پیروکاروں کا جتھہ۔ اسرائیل میں آ کر آباد ہونے والے انتہا پسند یہودیوں کی تحریک۔

ہوویوی زیون: زیون کے عقیدت مند۔ یہودی آبادکاروں کی تحریک جس کا آغاز لی اون پنسکر نے کیا۔

اسلام ازم:۔اسلامی مذہبی قوم پرستی: اسلام ایک سیاسی نظریہ ہے۔
اسلاموفاشزم: اس لفظ کے کوئی معانی نہیں ہیں۔
جاہلیہ: زمانہ جاہلیت، قبل از اسلام صحرائے عرب کا دور۔
کافر: مرتد، منحرف
پان عرب ازم: عرب دنیا کو یکجا کرنے کا سیاسی نظریہ۔
قطبست:۔مصری دانشور اور انتہا پسند تنظیم مسلم برادر ہوڈ کے رکن سید قطب کے طرفدار۔
ریجیس زائیونزم: اسرائیلی یہودیوں کی تحریک جو انجیل میں ذکر کئے گئے اسرائیل کو دوبارہ قائم کرنا چاہتی ہے۔
سلفزم: بیسویں صدی کی سنی اسلامی تحریک جو مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے زمانے میں واپس لے جانا چاہتی ہے۔
شہادہ: اسلامی عقیدے پر کاربند ہونے کا یہ اظہار کہ ''کوئی اللہ نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں''۔
شریعہ: اسلامی قانون
تکفیر: یکطرفہ طور پر کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کا عمل۔
ٹمپل ماؤنٹ / حرم شریف: یروشلم میں کوہ موریہ کی چوٹی پر بنا پلیٹ فارم جہاں کبھی یروشلم کا مندر ہوتا تھا اور جہاں اب چٹانی گنبد کھڑا ہے۔
علماء: اسلام کے مولوی۔اسلام کے مذہبی سکالروں کا مجموعہ
امّہ: دنیا بھر کی مسلمان امت / قوم
وہاب ازم: اسلام کے انتہا پسند رجعت پرست لوگوں کا فرقہ جس کی بنیاد انیسویں صدی میں عرب کے اصلاح پسند محمد ابن عبدالوہاب نے رکھی۔
وقف: ایسا اسلامی ادارہ جو لوگوں کو فلاحی امداد مہیا کرے۔یروشلم میں موجود اسلامی مذہبی ادارہ۔
زیلٹس: یہودی انتہا پسندوں کی متنوع تحریک جس نے پہلی صدی کے فلسطین کے اندر روم کے خلاف بغاوت کی رہنمائی کی۔
زائنزم: یہودی ریاست کی حمایت میں قائم ہونے والی ایک سیکولر قوم پرست تحریک۔